اخلاقیات

نویں اور دسویں جماعتوں کے لیے

سندھ ٹیکسٹ بک بورڈ

اخلاقیات

نویں اور دسویں جماعتوں کے لیے

سندھ ٹیکسٹ بک بورڈ، جام شورو

ناشر

نفیس اکیڈمی اردو بازار کراچی

تیار کردہ

سندھ ٹیکسٹ بک بورڈ، جام شورو و منظور شدہ وفاقی وزارتِ تعلیم حکومت پاکستان، اسلام آباد بطور واحد درسی کتاب برائے تمام مدارسِ پاکستان بموجب سرکلر نمبر ایس ۱۲-۳/۸۴-اے-ای-اے (آئی-ای) مورخہ ۲۹ ستمبر ۱۹۸۷ء

مؤلفین:-

پروفیسر سید محمد سعید

پروفیسر نجمہ عثمان

مدیر:-

محمد ناظم علی خاں ماتلوی

نظرِ ثانی:-

پروفیسر منور ابنِ صادق

ڈاکٹر عبدالحق خان حسرت کاس گنجوی

پروفیسر عبدالمجید سندھیلہ

غلام رسول خان

شبیر احمد

جارج پال

پروفیسر محمد قاسم مظہر

قاضی معصوم الرحمٰن

مطبع: شمس پرنٹنگ پریس۔ تاپر روڈ کراچی

فہرست مضامین

پیش لفظ

زیرِ نظر کتاب ثانوی سطح کے غیر مسلم طلبہ و طالبات کے لیے "اخلاقیات" کی نصابی ضروریات کے مطابق تحریر کی گئی ہے۔ "اخلاقیات" کا مضمون پاکستان میں اعلیٰ ثانوی سطح کے غیر مسلم طلبہ کے نصاب کا لازمی حصّہ ہے لیکن اب تک ثانوی سطح کے لیے اس کی کوئی درسی کتاب دستیاب نہ تھی جب کہ طلبہ و اساتذہ شدّت سے اس کی ضرورت محسوس کر رہے تھے۔ امید ہے کہ زیرِ نظر کتاب یہ ضرورت بطریقِ احسن پوری کرے گی۔

کتاب کی تصنیف میں قومی مقاصد تعلیم اور اخلاقی تعلیم کے خصوصی مقاصد کے علاوہ ثانوی سطح کے طلبہ و طالبات کی نفسیاتی کیفیت اور استعداد کو بھی سامنے رکھا گیا ہے۔ اس طرح کتاب کے مندرجات میں اخلاقیات کے مفہوم اور دائرۂ کار کی وضاحت کے لیے بنیادی اخلاقی اقدار اور اہم معاشرتی تصورات مثلاً حقوق و فرائض، بنیادی سماجی ادارے اور ان کا کردار، قانون اور اس کا احترام شامل ہیں۔ علاوہ ازیں اس کتاب میں مشہور مذاہبِ عالم کے پیشواؤں کی مختصر سوانح حیات، ان کی تعلیمات اور تہذیبی اثرات کا مجمل خاکہ بھی شامل ہے۔ ان تمام موضوعات پر موزوں مواد، زبان و بیان اور ترتیب و تدوین کے اعتبار سے نفسیاتی اصولوں کے مطابق پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور طلبہ کی دلچسپی کے نقطۂ نظر سے نصاب کے مطابق چند مناسب نظمیں بھی رکھی گئی ہیں۔ امید ہے کہ طلبہ اس کتاب سے بھرپور استفادہ کریں گے اور ہماری یہ سعی بارآور ثابت ہو گی۔ طباعتِ ثانیہ سے قبل مناسب تجاویز کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

پروفیسر محمد قاسم منظہر
ڈپٹی ایجوکیشنل ایڈوائزر
وزارتِ تعلیم اسلام آباد

اللہ پاکستان رہے

اللہ پاکستان رہے
جب تک سورج چاند ہیں باقی جب تک باقی جہان رہے
اللہ پاکستان رہے
پاکستان کا گوشہ گوشہ، گلی گلی آباد رہے
پاکستان کا بچہ بچہ، شاد رہے آباد رہے
آنکھیں ہوں خوابوں سے روشن سینوں میں ایمان رہے
اللہ پاکستان رہے

اس کے پہاڑوں دریاؤں پر میدانوں صحراؤں پر
اس کے بھرے پُرے شہروں پر ہر قریے ہر گاؤں پر
تیری رحمت کی بارش ہو تیرا کرم ہر آن رہے
اللہ پاکستان رہے

اس کے طفل و جواں کو جنوں دے عرفان و آگاہی کا
یا رب ان کو ڈھنگ سکھا دے، دلوں کی شاہنشاہی کا
علم محبت، محنت دے دے، عام تیرا فیضان رہے
اللہ پاکستان رہے

پاکستان میں بسنے والے، اپنی آپ نظیر رہیں
دل و دماغ و دست و بازو مصروفِ تعمیر رہیں
تو ہے ازل سے ابد تک قائم، قائم ترا نشان رہے

ضیا جالندھری

مشق

۱۔ شاعر پاکستان کے لیے کیا دعا مانگ رہا ہے ؟

۲۔ آنکھیں ہوں خوابوں سے روشن سینوں میں ایمان رہے۔
سے شاعر کی کیا مراد ہے ؟

۳۔ اس نظم کا خلاصہ نثر میں لکھیے۔

۴۔ اس نغمے کو مل کر سب گائیں۔

عِلمُ الاَخلَاق

عِلمُ الاَخلَاق یا اخلاقیات وہ عِلم ہے جو اعمال کی بھلائی اور برائی ظاہر کرے، لوگوں کو ایک دوسرے کے ساتھ معاملہ کرنے کے طریقے بتاتے ہوئے اس کے اصل مقصد سے آگاہ کرے۔ یہ علم محض خیر و بھلائی کو مقرّر کرنے تک ہی محدود نہیں بلکہ اس میں انسانی مزاج، ظاہری اثرات اور سیرت و کردار سب ہی شامل ہیں۔

اخلاق لفظ "خُلُق" کی جمع ہے، جس کے معنی "خاص وصف" کے ہیں۔ یعنی اخلاق سے مراد وہ ذہنی اوصاف ہیں جن کا اظہار انسان کی اندرونی اور نفسیاتی کیفیّات کے تحت ہوتا ہے۔ اس میں اچھے اور بُرے دونوں اوصاف شمار ہوتے ہیں۔ مگر عام طور پر اخلاق کا لفظ اچھے اعمال کے لیے ہی استعمال ہوتا ہے۔ بُرے اخلاق کے لیے بد یا بُرے کا اضافہ کرنا ضروری ہے۔ دوسرے لفظوں میں خُلق اس حالت کا نام ہے جو انسان کے نفس میں اس طرح موجود ہے کہ اس کے ذریعے خود بخود اعمال جاری ہوتے ہیں۔ اگر اس کے ذریعے صادر ہونے والے اعمال عقل اور مذہب کے مطابق اچھے ہیں تو اس کا نام حُسنِ خلق ہے اور اگر ناپسندیدہ اور بُرے اعمال ہیں تو وہ اخلاق بد یا بُرے اخلاق ہیں۔

جان ڈیوئی (JOHN DEWEY) کے نزدیک اخلاقیات کردار کا علم ہے، اس میں اچھے اور بُرے، نیک اور بد یا خیر و شر کے درمیان امتیاز کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ولیم للی (WILLIAM LILLY) کی نظر میں معاشرتی اداروں میں رہنے والے بنی نوع انسان کے کردار کا ایسا معیاری مطالعہ ہے جو کردار کو صالح اور غیر صالح قرار دینے میں ہماری مدد کرتا ہے۔ روجرس (ROGERS) کے مطابق جو علم ایسے اعمال کی تعلیم دیتا ہو جس سے انسانی کردار کے صحیح ہونے

کی سچی قدر و قیمت مقرّر ہو سکے اس کو عِلمُ الاَخلَاق کہتے ہیں۔ گویا اخلاقیات وہ علم ہے جو انسان کے کردار پر بحیثیت خیر و شر بحث کرتا ہے۔

جب انسان اِس دنیا میں آیا تو اُس کا تعلّق ایک دوسرے کے ساتھ قائم ہوا۔ اس طرح ایک معاشرہ وجود میں آیا جس کی وجہ سے اس نے باہمی ضرورت اور خواہش کے مطابق آپس میں ایک دوسرے کے آرام اور خوشی کا سامان مہیا کرنے کی کوشش کی۔ اسی خواہش کی تکمیل جب خوبی کے ساتھ انجام دی گئی تو وہ فرض شمار ہونے لگی۔ اس طرح اس تعلق کو اچھے طریقے سے انجام دینا ہی دراصل اخلاق ہے، جس کو آداب، فضائل یا اَطوار بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس کا وجود اس وقت سے ہی ہے جب کہ انسان کی زندگی اور اس کے جسمانی و ذہنی اعمال کا وجود ہے۔

اخلاقیات کے لیے انگریزی زبان میں ETHICS اور MORALITY کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں MORALITY لاطینی لفظ MORAL سے ۔ ہے جو MORES سے نکلا ہے۔ اس کے معنی رسم و رواج ہیں۔ ETHICS کے معنی بھی رسم و رواج ہیں۔ یعنی بنیادی طور پر دونوں الفاظ ہم معنی ہیں۔ مگر آج ان الفاظ کے معنی محض رسم و رواج تک محدود نہیں رہے۔ بلکہ اس میں بڑی وسعت آگئی ہے۔ اخلاقیات انسان کے باہمی اخلاقی تعلقات کے سائنسی مطالعہ کا نام تو ہے ہی، لیکن یہ معیاری علم بھی ہے جو انسانی کردار کو خیر و فلاح کے نظریے سے پرکھتا ہے۔

دنیا میں جتنے بھی مذاہب ہیں ان میں کسی نہ کسی انداز سے اخلاقی تعلیم موجود ہے۔ ویدوں نے اپنی تعلیم میں دل کی صفائی اور قول و عمل میں سچائی کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ ان کی تعلیم یہ ہے کہ ماں باپ کا کہنا مانو، بھائی بہن کی عزت کرو دنیا میں امن و سکون کے طلب گار بنو۔ رام چندر جی نے اپنی شرافت اور حُسنِ خُلق سے لوگوں کو متاثر کیا۔ نیکی اور شرافت کی ایک مثال قائم کی۔ توریت زبور، انجیل اور قرآن پاک میں باقاعدہ اخلاقی ہدایات کثرت سے موجود ہیں۔ اسی طرح یونانی علوم و فنون کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے علوم میں ایک

شعبہ اخلاق کا بھی ہے۔ جس پر بڑے بڑے فلاسفروں اور مُفکّروں نے اظہارِ خیال کیا ہے۔ کسی نے قانون کو، کسی نے فطرت کو، کسی نے ضمیر کو اور کسی نے عقل کو اخلاق کا مَنبَع قرار دیا اور یوں اخلاقیات کی افادیت اور اہمیت ہر دور میں تسلیم کی گئی۔

اخلاقیات کا تعلق دراصل انسانی کردار سے ہے۔ اس میں یہ بحث کی جاتی ہے کہ کون سا کردار اچھا ہے اور کون سا بُرا ہے۔اس کا موضوع انسان کے دو قسم کے اعمال ہیں۔ایک وہ جس کے کرتے وقت ارادہ اور مرضی کو دخل ہوتا ہے۔ دوسرے وہ جو بلا ارادہ ہوتے ہیں۔ مگر انھیں بھی درست رکھنے میں احتیاط برتی جاسکتی ہے۔ اس طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ علم الاخلاق انسان کے ارادی اعمال سے بحث کرتا ہے خواہ وہ خودارادی ہوں یا ان کے اسباب ارادی ہوں۔

اخلاقیات میں عام طور سے اس بات کی تفصیل ہوتی ہے کہ کون سے اعمال کو بجالانا چاہیے اور کون سے کاموں سے بچنا چاہیے۔ وہ کون سی باتیں ہیں جنھیں معاشرے میں بُری نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور کن باتوں کو پسند کیا جاتا ہے۔ یہ بات ہمیں یاد رکھنی چاہیے کہ ہماری اندرونی کیفیات اور خارجی اعمال میں جس قدر مطابقت ہوگی اسی قدر اخلاقی وصف ہم میں زیادہ پیدا ہوگا اور جس قدر دونوں میں فرق ہوگا اسی قدر اخلاق کا معیار گرتا چلا جائے گا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جب ہمارے اعمال انسانی کردار کے اخلاقی اُصول وضوابط کے مطابق ہوتے ہیں تو اس کے نتیجہ میں خیر کو فروغ ہوتا ہے اور افعال اس کے برعکس ہوں تو شر فروغ پاتا ہے۔ ایک معمولی سی مثال ہے کہ کوئی شخص کسی بیمار کی مزاج پرسی یا تیمارداری خدا کا حکم جان کر کرتا ہے تو لازماً اسے دلی مسرّت حاصل ہوتی ہے۔ جس کے اثرات دوسروں پر بھی اچھے پڑتے ہیں اور جو اس کے برخلاف مزاج پرسی میں اندرونی اور خارجی کیفیات کو یکساں نہ رکھ سکے گا تو اس کا دل خوش نہیں ہوگا بلکہ دوسروں پر بھی اس کا اچھا اثر نہیں پڑے گا۔

اخلاقیات ایک معیاراتی اور قدریاتی علم ہے۔ معیاراتی علم سے مراد وہ علم ہے جو حقائق کا اس طرح سے جائزہ لے کہ انھیں کیسا ہونا چاہیے۔ اس کا تعلق نہ صرف کردار کے مطالعہ سے ہے بلکہ وہ انسان کے کردار کا تجزیہ خیر و شر، نیکی و بدی اور صحیح و غلط کو سامنے رکھ کر کرتا ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ تمام نیکیوں اور برائیوں کی گنتی شمار کر کے بتا دے، بلکہ اس کا مقصد اصل میں ہمارے اندر وہ شعور اور احساس پیدا کرنا ہے جس کے تحت ہم خود کسی بھی عمل کو جانچ کر اس کی قدر و قیمت مقرر کر سکیں۔

اخلاقیات کے بارے میں یہ اختلاف پایا جاتا ہے کہ آیا علم الاخلاق عملی علم ہے یا نہیں۔ عام طور سے اسے ایک نظری علم قرار دیا جاتا ہے۔ کیوں کہ اخلاقیات کا علم انجینئرنگ، فن تعمیر، طبّ اور جرّاحی کی طرح عملی نہیں ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ جو شخص طبّ یا جرّاحی کا ماہر ہے وہ نہ صرف اس کے اصولوں کو ذہن نشین کرتا ہے بلکہ عملی طور پر بھی بیماریوں کے علاج میں انھیں استعمال کرتا ہے جب کہ اخلاقیات کا مطالعہ کرنے والے سے اس سے زیادہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ عام زندگی میں بہتر اخلاق کا مظاہرہ کرے۔ مگر یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ ہر دوسرے کے مقابلے میں زیادہ نیک اور با اخلاق ہوگا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ علم الاخلاق نیک یا بد نہیں بناتا بلکہ صرف اخلاقی نصب العین کا علم فراہم کرتا ہے اور اس علم کے ذریعے ہر شخص اچھے اور برے میں اِمتیاز کر سکتا ہے۔ بعض ماہرین نے اس سے اختلاف بھی کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر اخلاقیات کا علم ہماری عملی رہنمائی نہیں کرتا تو اس کی افادیت بھی مشکوک ہے۔ ان کے نزدیک جب تک نظریہ اور عمل ساتھ ساتھ نہ چلے غیر مُؤثّر ہوتا ہے۔ لیکن دوسرے ماہرین کی رائے یہ ہے کہ علم الاخلاق کا کام رہنما اصول فراہم کرنا اور یہ بتانا ہے کہ ان پر کیسے عمل کیا جائے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اخلاقیات محض ایک نظری علم ہے کیوں کہ اس کا موضوع ہی انسانی کردار و عمل ہے۔ اخلاق بہر حال اعمالِ خیر کے مجموعے کا نام ہے۔ لہٰذا اس میں کوئی

شبہ نہیں کہ اخلاقیات ایک عملی علم بھی ہے اس کا نصب العین اصلاحِ اخلاق ہے۔
علم الاخلاق کی نوعیت اور اہمیت کا جائزہ لینے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اس کا
تقابل بعض دوسرے علوم سے کریں۔

اخلاقیات اور عمرانیات

عمرانیات کو معاشرے کا علم کہا جاتا ہے۔ اس میں معاشرہ اپنے تمام انسانی
شعبوں کے ساتھ زیرِ بحث آتا ہے اور لوگوں کے معاشرتی تعلقات، رسم و رواج
اور قاعدے قوانین کے ساتھ ساتھ انسانی رَوَیّہ، میلان اور رُجحان کو بھی زیرِ مطالعہ
رکھا جاتا ہے۔ اس طرح اس میں نیکی و بدی اور خیر و شر کا تصور موجود ہے۔ اور
یہی تصور اخلاقیات اور عمرانیات میں کسی حد تک مطابقت پیدا کرتا ہے۔

اخلاقیات اور نفسیات

نفسیات ذہنی اعمال اور کردار کا علم ہے۔ یہ علم ہماری شخصیت کے
اندرونی اور ظاہری پہلوؤں کا جائزہ لیتا ہے۔ یہ تو ہم سب جانتے ہیں کہ ہمارے
تمام افعال کے پیچھے ہمارے مَقاصِد اور ہماری خواہشات کار فرما ہیں، ان کی اصل
حیثیت سے آگاہ ہونے کے لیے نفسیاتی مطالعہ کیا جاتا ہے۔ علم الاخلاق ایک معیاراتی
علم ہے جو اپنے زیرِ بحث ان حقائق کو لاتا ہے جن کا تعلق ہمارے کردار اور اعمال
سے ہے۔ نیز ہمارے ارادی افعال اور ہماری خواہشات کی اصلیت معلوم کرنے کے
لیے ان کا نفسیاتی تجزیہ بہت ضروری ہے۔ لہٰذا یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ اخلاقیات کی بنیادیں
نفسیات پر استوار ہوتی ہیں اور ان دونوں علوم کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔

اخلاقیات اور مذہب

مذہب کی ابتداء کسی ماورا ہستی کو تسلیم کرکے اس کی رضا اور خوشنودی

حاصل کرنے کی خواہش سے ہوتی ہے۔ مذہب میں انسان کے تمام اعمال کا دارومدار اس کی نیت کی درستی اور سلامتی پر رکھا گیا ہے۔ مذہب میں اعتقادات کو تسلیم کرکے ان پر مضبوطی سے قائم رہنے کی تاکید کی گئی ہے۔ یہ ہی اعتقادات اخلاقیات کے لیے بنیاد فراہم کرتے ہیں۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو ان دونوں علوم میں گہرا تعلق نظر آتا ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں جس طرح اخلاقیات کے لیے مذہبی اعتقادات کی بنیاد ضروری ہے۔ اسی طرح مذہب کے لیے اخلاقی نصب العین لازمی ہے۔ مختصر یہ کہ بحثوں اور طویل دلائل سے قطع نظر یہ ثابت ہے کہ اخلاقیات انسان کے کردار کو سنوارنے اور بلند مرتبے پر پہنچانے میں معاون و مددگار ہے۔ انسان خواہ اپنی فطرت کے اصرار پر یا ضمیر کی آواز سے مجبور ہوکر ایک کام کرے یا اسے اپنا فرض سمجھے یا کسی مصلحت کی خاطر اسے انجام دے۔ اگر وہ خیر اور بھلائی کا کام ہے تو اس کی انجام دہی سے نہ صرف خود وہ روحانی سکون اور اطمینان حاصل کرے گا، بلکہ معاشرے میں دوسرے لوگوں پر بھی اس کے اچھے اثرات مرتب ہوں گے۔ بلاشبہ اخلاقیات کی غرض و غایت ہی یہ ہے کہ وہ نفس انسانی کو اس طرح نکھار دیتا ہے جس کے ذریعے اس کی ذات کی ہی اصلاح نہیں ہوتی بلکہ دوسروں کے ساتھ جو تعلقات اور روابط قائم ہوتے ہیں وہ بھی پُر مسرت اور خوش آئند ہوتے ہیں اور اچھا انسان وہی ہوتا ہے جو زندگی کے تمام معاملات میں اچھا ہو، کیونکہ اخلاقیات کا تعلق نیت، مقصد اور ارادے کی درستی کے ساتھ ساتھ ظاہری اعمال کے نتائج کے ساتھ بھی ہوتا ہے۔

مشق

۱۔ عِلمُ الاَخلَاق کیا ہے؟ وضاحت کیجیے۔

۲۔ علم الاخلاق کے بارے میں مختلف مُفکّروں کی کیا آراء ہیں؟ بیان کریں۔

۳۔ اخلاقیات کا تعلق انسانی کردار سے کس طرح ہے؟

۴۔ اخلاقیات کا دوسرے کون کون سے علوم سے گہرا تعلق ہے؟

۵۔ اپنے دوست کو ایک خط لکھیے جس میں اخلاقیات پر بحث کیجیے۔

۶۔ صحیح جواب کا انتخاب کر کے خالی جگہ پُر کیجیے۔

(الف) اخلاق لفظ .... کی جمع ہے۔ (خلیق، اخلاص، خُلق)

(ب) اخلاقیات وہ علم ہے جو انسان کے کردار پر بحیثیت .... بحث کرتا ہے۔

(علم وادب، اخلاقی کردار، خیر و شر)

(ج) دنیا میں جتنے بھی مَذاہب ہیں اس میں کسی نہ کسی انداز سے ....

موجود ہے۔ (اخلاقی تعلیم، تجارتی تعلیم)

اللہ تمام خوبیوں کا مالک ہے

اکثر لوگوں کے ذہن میں خیال آتا ہے کہ کیا خدا ہے؟ اگر ہے تو اس کی صفات کیا ہیں اور اس کا عمل کیا ہے؟ ان سوالوں کے مثبت جوابات پر ہماری پوری زندگی کا انحصار ہے اور کائنات جن اصولوں پر قائم ہے اس کو دیکھتے ہوئے یہ سمجھنا مشکل نہیں ہے کہ اس کو کسی ماورا ہستی نے پیدا کیا ہے۔ یہ ہستی، یہ ذات اللہ تعالیٰ کی ہے جو ساری کائنات کا خالق اور مالک ہے۔ ہر جگہ اس کا حکم چلتا ہے۔ ہر چیز اس کی مرضی اور فیصلے کی پابند ہے۔ افراد کی موت اور زندگی، خوشی و غمی، امیری و غریبی سب کچھ خدا ہی کے ہاتھ میں ہے۔ دنیا کی کوئی طاقت اس کے کیے ہوئے فیصلے کو نہیں بدل سکتی۔

جب ہم اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ کائنات اپنی تخلیق میں خدا کی محتاج ہے تو دوسری طرف ہم یہ اقرار کر رہے ہوتے ہیں کہ خدا اپنے وجود میں کسی کا محتاج نہیں ہے۔ کیوں کہ کائنات کا پیدا کرنے والا وہی ہو سکتا ہے جو خود کسی کا محتاج نہ ہو۔ وہ ہمیشہ سے موجود ہے اور ہمیشہ ہمیشہ موجود رہے گا۔ ہم اس کے وجود کا تصوّر اس حد تک کر سکتے ہیں جس حد تک ہمارے ذہنوں کی رسائی ممکن ہے۔ اس کی ابتدا اور انتہا تک پہنچنا ہمارے لیے ممکن نہیں ہے۔ وہ لامحدود ہے۔ اس کی ذات کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔

خدا تمام مادّی خصوصیات سے پاک ہے۔ وہ سنتا اور دیکھتا ہے۔ لیکن ہم کسی بھی سننے اور دیکھنے والے وجود سے اس کو تشبیہ نہیں دے سکتے۔ وہ ہر چیز سے الگ ہے اور کوئی چیز اس جیسی نہیں۔ خدا کا اپنا ایک وجود ہے۔ جس کا یقین ہم اسے چھو کر یا دیکھ کر نہیں کر سکتے۔ البتہ ان بے شمار نشانیوں اور دلائل کو دیکھ کر کر سکتے ہیں جو کائنات میں ہر طرف موجود ہیں۔

دنیا کے تمام مذاہب میں کسی نہ کسی طرح خدا کی ہستی کا اقرار موجود ہے۔
بات یہ ہے کہ انسان کی فطرت اور کائنات کا نظم وضبط اس امر کی دلیل ہے کہ خدا موجود ہے۔ ذرا غور کیجیے یہ ہرے بھرے لہلہاتے ہوئے کھیت، یہ ہوا، یہ چاند اور سورج، یہ جگ مگ جگ مگ کرتے تارے، یہ آسماں، یہ بدلتے ہوئے موسم، یہ لمبے دریا، یہ اونچے اونچے پہاڑ یہ دور دور تک پھیلے ہوئے سمندر، یہ رنگ برنگے پھول، یہ چرند پرند، ان سب کو پیدا کرنے والا کوئی نہ کوئی ضرور ہے۔ کوئی ہے جو سب سے بالا ہستی ہے جو خالق ہے، جس نے ان تمام چیزوں کو تخلیق کیا ہے اور پھر اس سارے نظام کو بڑی خوبصورتی اور نہایت پابندی سے چلا رہا ہے کہ لاکھوں سال ہو گئے معمولی سا بھی فرق نہیں آیا ہے۔ ہر چیز اپنے مقرّر کردہ اصولوں کے تحت مصروفِ عمل ہے۔ سورج کبھی مغرب سے نہیں نکلتا۔ ہوا چلنے کے عمل کو کبھی نہیں بھولتی۔ موسم ہمیشہ اپنے وقت پر آتے ہیں اور جاتے ہیں۔ کائنات میں ایک منظم و مرتّب نظام قائم ہے جس کے تحت ہوا، پانی، روشنی، موسم کی تبدیلی و طبعی خواص رونما ہوتے ہیں۔ اس ہمہ گیر قانون کو دیکھ کر اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ کوئی ایسی ہستی موجود ہے جو سب کچھ سنتی ہے سب کچھ دیکھتی ہے۔ سب پر قادر ہے جو سارے کائنات کے نظام کو چلانے پر قدرت رکھتی ہے اور وہ خدا کی ذات ہے۔ جسے کسی بھی نام سے پکارا جاسکتا ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ کائنات کا آغاز مادے سے ہوا۔ سوال پیدا ہوتا ہے آخر مادّہ کیا شے ہے اور کیوں کر وجود میں آیا۔ اس طرح کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ کائنات کا وجود حادثاتی طور پر ہوا، تو معلوم کیا جائے کہ حادثہ یا اتفاق کی معنوی حیثیت کیا ہے۔ جو عمل لاکھوں سال پہلے وجود میں آیا تھا تو کیا وہ دوبارہ پھر عمل میں آسکتا ہے اور یہ کہ دوبارہ ایسا کیوں نہیں ہوتا؟ ان سوالات کے جواب کی تہہ میں جائیں تو انھیں رد کر کے یہ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ کائنات کی تخلیق نہ مادے سے ہوئی اور نہ یہ کسی حادثے کا سبب ہے بلکہ اس کا خالق خدا ہے جس نے ارادے کے ساتھ اس کی تخلیق کی ہے۔

تمام مذاہبِ عالم کے ماننے والے اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ خدا کا وجود یقینی، ازلی اور ابدی ہے۔ اس کی ذات بے مثال الٰہیاتی قوت ہے اور تمام فضائل کی مالک ہے۔ خدا ہی انسان کے تمام اعمال کی جزا یا سزا دیتا ہے۔

یوں تو خدا کی ذات ہماری سوچ سے بہت بلند ہے۔ لیکن ہم اس کی صفات کے ذریعے اس کی ذات تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔ جس حد تک اس کی صفات ہماری سمجھ میں آجائیں گی اسی حد تک ہم اس کی ذات کے بارے میں آگاہ ہو سکتے ہیں۔

خدا کی ذات تمام صفات اور فضائل کی مالک ہے۔ وہ کائنات کا خالق ہے وہ رب ہے وہ مالک ہے۔ رحم کرنے والا ہے۔ وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ وہ جاننے والا اور خبر رکھنے والا ہے۔ وہ عظیم ہے اور تنہا ہے، وہ عادل ہے اور منصف ہے۔ وہ ہر چیز پر قادر اور حاکم ہے۔ ان صفات سے ظاہر ہوتا ہے کہ خدا وہ ہستی ہے جو مکمل، بلند اور مختارِ کُل ہے۔ جس کی صفات اور فضائل انسانی اخلاق کی نشو و نما اور کردار سازی کے لیے خارجی معیار کا کام دے سکتے ہیں۔ خدا کی ان صفات کو اپنے سامنے رکھ کر ان کا رنگ اپنی زندگی میں بشری حد تک سمونے کی کوشش کرنا ہی در حقیقت خدا کا اقرار ہے۔

جس طرح خدا کے وجود کو ماننے پر انسان کے تمام عقائد و اعمال کا انحصار ہے اسی طرح اس کی صفات کو انسانی کردار کی اصلاح و تعمیر کے لیے ایک نمونہ قرار دینا ناگزیر ہے۔ صفات خداوندی کو اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ مثلاً خدا کی صفت ربوبیت کو سامنے رکھتے ہوئے کہ وہ تمام جہانوں کا پالنے والا اور پرورش کرنے والا ہے، ہمیں ان لوگوں کی جو ہم میں ہیں خدمت اور ان کی ضروریات کا بندوبست کرنا چاہیے۔ اس طرح خدا کی صفت رحمانیت ہے جس کے ذریعے وہ انسان کو بغیر کسی بدلے اور معاوضے کے اپنے انعامات سے نوازتا ہے۔ اس کی صفت اپنے سامنے رکھتے ہوئے ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ کسی لالچ یا امید کے بغیر نیکی کا برتاؤ کرنا چاہیے۔ خدا رحیم ہے اور

وہ اپنے بندوں پر بار بار رحم کرتا ہے۔ اس کی روشنی میں ہمیں آپس میں ہمدردی اور رحم دلی کے جذبات سے کام لینا چاہیے۔ خدا مالک ہے، عادل ہے۔ درگذر کرنے والا ہے۔ اس کے ان صفات کا عکس ہمیں بھی اپنے اخلاق میں پیدا کرتے ہوئے ایک دوسرے سے انصاف اور درگذر کا معاملہ کرنا چاہیے اسی طرح اس کی دوسری صفات ہیں جنھیں حتی الامکان بشری قوت کے مطابق اپنانے کی کوشش کرنی چاہیے۔

خدا کی ذات ہر طرح کی کمزوری اور شک و شبہ سے پاک ہے۔ اس لیے خدا نے انسان کے اعمال کا ٹھیک بدلہ دینے کا ایک مقام اور وقت مقرر کر دیا ہے۔ جس دن کسی کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہوگی۔

جب ہم یہ اقرار کرتے ہیں کہ خدا تمام مخلوقات اور کائنات کا مالک ہے تو یہ اقرار اس کا ثبوت ہے کہ خدا ہی تمام اعمال کی جزا یا سزا دیتا ہے۔ وہ سمیع وبصیر یعنی سنتا اور دیکھتا ہے اور وہ سب کچھ جانتا اور ہر بات کی خبر رکھتا ہے۔ لہٰذا وہ ہر ایک کے ظاہر و باطن سے واقف ہے۔ وہ جانتا ہے کہ کون کیا کر رہا ہے؟ کیا کرے گا یا کیا کرتا رہا ہے، یہاں تک کہ لوگوں کے دلوں اور ان کے ارادوں تک سے واقف ہے۔ اس لیے اسے کوئی مشکل نہیں کہ ہر ایک کو ان کے اعمال کا ٹھیک ٹھیک بدلہ دے۔ خدا کی ایک صفت اس کا عدل اور انصاف ہے۔ یعنی وہ منصف اور عادل ہے اور اسے کسی کو بدلہ دینے پر پورا پورا اختیار ہے۔ اسے اس کی ضرورت نہیں ہے کہ کوئی کسی کی سفارش کرے یا اسے مشورہ دے، وہ ہر چیز سے پوری طرح باخبر ہے اور اسے لوگوں کو ان کے اعمال کی جزا یا سزا دینے کا پورا اختیار حاصل ہے۔

ان عقائد پر ایمان رکھنے سے انسان باکردار، بلند اخلاق اور نیک بن جاتا ہے۔ وہ دنیا کی بڑی سے بڑی ہستی سے بے نیاز اور بے خوف ہو جاتا ہے۔ دوسروں کے آگے دست سوال بڑھانے کے بجائے وہ صرف خدا سے مانگتا ہے اور اس کے آگے جھکتا ہے۔ وہ وسیع النظر اور کشادہ ذہن ہو جاتا ہے اور کسی حال میں بھی مایوس اور پست ہمت نہیں ہوتا۔ وہ بہادر اور بُردبار

ہو جاتا ہے۔ اس کی خدا کی صفات میں سے کوئی ایک صفت بھی اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش اسے بلند اخلاقی پر پہنچا دیتی ہے اور اس کی نظر میں بلندی کا معیار دنیاوی مال و اسباب اور دولت نہیں ہوتا بلکہ اسے معلوم ہوتا ہے کہ بڑائی حرص و لالچ اور حسد و تعصّب سے پاک ہونے سے حاصل ہوتی ہے۔

بلاشبہ خدا تمام قوتوں کا سرچشمہ اور مختار کُل ہے۔ اس عقیدے کی بدولت انسان کے سارے عقائد، اعمال، معاملات اور اخلاق درست ہو جاتے ہیں۔

مشق

۱۔ اس ساری کائنات کا خالق اور مالک کون ہے؟

۲۔ وہ کون سی صفات ہیں جن سے ہم خدا کی ذات کو پہچانتے ہیں؟

۳۔ دنیا کے تمام مذاہب خدا کے بارے میں کس انداز سے سوچتے ہیں؟

۴۔ تمام اعمال کی جزا یا سزا کون دیتا ہے۔

۵۔ خدا کی ذات تمام صفات اور فضائل کی حامل ہے۔ وضاحت کیجیے۔

۶۔ ذیل کے جملوں کو پڑھیے اور جواب میں صرف "صحیح" یا "غلط" لکھیے۔

(الف) افراد کی موت و زندگی، خوشی و غمی، امیری و غریبی سب کچھ خدا ہی کے ہاتھ میں ہے۔

(ب) خدا تمام مادّی خصوصیات سے پاک ہے۔

(ج) خدا تمام فضائل کا مالک نہیں ہے۔

(د) خدا کی ذات ہر طرح کی کمزوری اور شک و شبہ سے پاک ہے۔

(ہ) خدا تمام قوتوں کا سرچشمہ نہیں ہے۔

انسانی اور اخلاقی اَقدار

خدا تعالیٰ نے انسان کو تمام دنیا سے افضل یعنی اشرف المخلوقات بنایا ہے۔اسے بڑی حد تک اختیار اور مکمل آزادی بھی دی ہے۔ اس کی فطرت میں نیکی اور بدی کی صلاحیتیں پیدا کی ہیں اور اسے اس بات کی استعداد دی ہے کہ وہ ان دونوں کے درمیان امتیاز کر سکے جو اخلاقی قدریں اس کے اندر چھپی ہوئی ہیں۔علم اور شعور کے ذریعے واضح کر کے پیش کرنے کی اس میں صلاحیت موجود ہے۔

دراصل انسان ایک قدر شناس ہستی ہے۔ قدر سے مراد یہ ہے کہ ہر ایسی چیز جو ہماری کسی ضرورت، غرض یا خواہش کو پورا کرتی ہے۔ مثلاً اناج یا پھل ہماری خوراک کی ضرورت پوری کرتے ہیں۔ اس لیے یہ ہمارے لیے ایک قدر کا درجہ رکھتے ہیں۔ اسی طرح مال و دولت سے ہماری آسائش و آرام کا سامان مہیا کیا جاسکتا ہے۔ لہٰذا مال و دولت بھی ایک قدر رکھتے ہیں لیکن اخلاقیات کی رو سے قدر سے مراد صرف یہ نہیں ہے کہ جس کی خواہش کی جائے وہ ہماری خواہش کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ بلکہ وہ بھی ہے جس کی خواہش کی جانی چاہیے۔ چاہے اسے حاصل کرنے میں ہمیں اپنی بہت سی خواہشوں کو قربان ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ مشہور فلسفی کانٹ کے نزدیک کائنات میں صرف ارادہ ہی ایک ایسی قدر ہے جسے ذاتی قدر کا درجہ دیا جاسکتا ہے۔ اس کے مقابلے میں ایک اور فلسفی خوشی کے سوا ہر چیز کی حیثیت محض ایک وسیلے کی سی سمجھتا ہے۔ تمام سرگرمیوں کا اصل مقصود و منتہا صرف خوشی کا حصول ہے۔ کچھ لوگ حسن و جمال کو، کچھ محبت کو، کچھ آزادی کو اور کچھ علم کو یا اسی طرح کی دوسری چیزوں کو ذاتی اقدار قرار دیتے ہیں۔ بہرحال ذاتی قدر سے مراد وہ چیز ہے جو خود اپنی ذات کی حد تک اس قابل ہو کہ اسے حاصل

کرنے کی خواہش کی جائے وہ کسی اور چیز کا ذریعہ نہ ہو۔

انسان کے قدر شناس ہونے کا تعلق اس بات سے ہے کہ وہ زندگی میں چھپی ہوئی ان ذاتی اقدار کو پہچانے جو خود اپنی پہچان ہوتی ہیں۔ اور کسی چیز کی محتاج یا دست نگر نہیں ہوا کرتیں۔ انسان کی تعریف کرتے وقت وہ تمام پہلو نظر میں رکھنے چاہییں جن کے ذریعے اس کی اصل حقیقت اور جامع صفات سامنے آجائیں کیوں کہ جزو کو کُل قرار نہیں دیا جاسکتا، چاہے وہ کتنا ہی اہم حصّہ کیوں نہ ہو۔ اس کی مثال ہم یوں دے سکتے ہیں کہ دل انسان کے جسم میں ایک انتہائی اہم حصّہ ہے، لیکن یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ دل ہی انسان ہے یا یہ کہ انسان دل ہے۔ کیونکہ دل کے علاوہ اور بھی کئی اجزاء اور حصے ایسے ہیں جن کے ملنے سے انسان کا وجود مکمّل ہوتا ہے۔

انسان چونکہ قدر شناس ہے اس لیے وہ فطری طور پر اچھے اور بُرے میں تمیز کرنے کا شعور رکھتا ہے۔ نیکیوں کو ان کی نوعیت کے لحاظ سے وہ انھیں پسند کرتا ہے۔ اسے اس بات کا احساس ہے کہ نیکی اصل میں کیا چیز ہے، اس کی اقدار کیا ہیں اور یہ ہماری زندگی پر مجموعی طور پر کس طرح اثر انداز ہوتی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اسے بُرائیوں سے فطری طور پر نفرت ہے۔ وہ خوب جانتا ہے کہ برائی یا بدی کی اصل کیا ہے۔ معاشرے میں اور ذاتی زندگی میں اس کے کیا اثرات مرتب ہوسکتے ہیں۔ وہ اپنی فطری صلاحیتوں کے تحت اچھائی اور بُرائی میں واضح طور پر فرق محسوس کرسکتا ہے۔ یہ اس کے اختیار میں ہے کہ وہ جس چیز کا چاہے انتخاب کرلے۔

انسان صرف طبعی جسم سے عبارت نہیں ہے۔ بلکہ ایک اور چیز ہے جسے ہم ذات یا نفس کہتے ہیں۔ یہ وہ چیز ہے جو ہر انسان کو خدا کی طرف سے ملتی ہے۔ اس میں اس بات کا امتیاز نہیں کہ وہ امیر ہے یا غریب، کسی ایک خطے، رنگ و نسل یا مذہب سے تعلق رکھتا ہے یا کسی دوسرے سے۔ یہ ہر شخص میں موجود ہوتی ہے اور بچّے کی نشوونما کے ساتھ ساتھ اس کے مذہب اور قواعد وضوابط کے تحت فروغ پاتی ہے۔

خدا نے انسان کو یونہی پیدا نہیں کیا۔ اس کی پیدائش کا بھی کوئی نہ کوئی مقصد ہے۔ ایک مخصوص مقصد کے ساتھ اسے دنیا میں بھیجا جاتا ہے اور اس میں یہ شعور پیدا کیا جاتا ہے کہ وہ خدا کی عبادت کے ساتھ ساتھ دوسرے انسانوں کے احساسات اور جذبات کا احترام بھی کرے۔ کسی کو اس بات کا حق حاصل نہیں کہ وہ اپنے علاوہ دوسروں کو حقیر تصوّر کرے یا دوسروں کے مذہب کو بُرا کہے یا زبردستی اپنی اطاعت پر مجبور کرے۔

مشق

۱۔ قدر سے کیا مراد ہے؟
۲۔ زندگی میں چھپی ہوئی ذاتی اقدار کو پہچاننے سے کیا مطلب ہے؟
۳۔ خدا نے انسان کو دنیا میں کس مقصد کے لیے بھیجا ہے؟
۴۔ انسان اپنی ذات یا شخصیت کی تکمیل کس طرح کرتا ہے؟
۵۔ ذیل کے جملوں کو پڑھیے اور جواب میں صرف صحیح یا غلط لکھیے۔
(الف) انسان ایک قدر شناس ہستی ہے۔
(ب) انسان کی فطرت میں نیکی اور بدی کی صلاحیتیں نہیں ہیں۔
(ج) مال و دولت بھی ایک قدر رکھتے ہیں۔

اخلاقی کردار

خالقِ کائنات نے اپنی تمام تر مخلوقات میں انسان کو سب سے زیادہ اختیارات اور قدرت عطا کی ہے اور وہ اس کائنات میں اشرف المخلوقات کا درجہ رکھتا ہے۔ اسے اپنی بساط کے مطابق ہر قسم کی آزادی عطا کی گئی ہے۔ اسے مکمل طور پر یہ اختیار دیا ہے کہ وہ جس طرح چاہے اچھے اور بُرے اعمال سے زندگی بسر کرے۔ جب کہ کائنات کی دیگر مخلوق صرف اس ہستی کے حکم کے مطابق تابعِ فرمان زندگی گذارتے ہیں۔ مثلاً جس جاندار کے لیے جو غذا مقرر کی گئی ہے وہ صرف اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔ اگر انھیں جان بوجھ کر بھی دوسری غذا کھلانا چاہیں تو وہ نہیں کھائیں گے۔ گوشت خور جانور گوشت کھائیں گے اور جن جانوروں کی خوراک نباتات مقرر کی گئی ہے وہ صرف نباتات پر گذارہ کرتے ہیں۔ لیکن اس کے برعکس انسان حسبِ خواہش جس غذا کو کھانا چاہے وہ کھالیتا ہے۔ یہاں تک کہ جو خوراک اسے نقصان پہنچاتی ہے وہ بھی نادانستہ یا جان بوجھ کر استعمال کرنا چاہے تو اس کے لیے بھی وہ اپنی مرضی کا مالک ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ مخلوقات میں انسان کو چھوڑ کر دنیا کی دیگر جاندار مخلوق اپنی ابتداء سے ہی ایک ہی قسم کی زندگی گذار رہی ہے۔ اس کی حالت میں، اس کی عادات و اطوار میں، اس کے رہن سہن کے طریقے اور اجزائے خوراک میں ابتداء سے لے کر آج تک کوئی فرق نہیں آیا۔ پرندوں کو دیکھیے وہ جس قسم کے گھونسلے اوّل دن سے بناتے آئے ہیں آج بھی ویسے ہی گھونسلے اپنے رہنے کے لیے بنا رہے ہیں ان میں ایک پرندہ بیا بھی ہے جو اپنا گھونسلہ بڑی کاری گری سے بناتا ہے۔ لیکن اس کے گھونسلے بنانے میں مزید کوئی جدّت پیدا نہیں ہوئی۔ جیسا اسے خالقِ کائنات نے سکھا دیا ہے وہ ہمیشہ سے ویسا ہی گھونسلہ بنا رہا ہے۔

اگر ہم انسانی زندگی کا مطالعہ کریں تو ہم دیکھتے ہیں کہ ہزاروں سال پہلے کے انسان اور آج کے انسان کے معاملات زندگی، رہن سہن اور ہنر مندی میں اتنا فرق آگیا ہے کہ آج اگر وہ چاہے تو وہ اپنے پیدا کردہ اسباب کے ذریعے ہزاروں میل دور کی ایک باریک سوئی کو گھر بیٹھے اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے۔ وہ چاند ستاروں تک اپنی رسائی کر رہا ہے۔ اس سے اندازہ ہوا کہ کائنات میں بسنے والی تمام تر مخلوق میں صرف انسان ہی ایسی ہستی ہے جو اپنی مرضی سے اپنے افعال انجام دیتا ہے اور کائنات کے تمام جانداروں میں سب سے زیادہ قدرت رکھتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اپنی تمام تر قدرت اور صلاحیت کے باوجود بہت سے معاملات میں مجبور محض ہے۔ جس میں سے انسان کی سب سے بڑی مجبوری موت کا عمل ہے۔ جس کا ذائقہ تمام جانداروں کو خواہ وہ انسان ہوں یا حیوان چکھنا پڑتا ہے۔ موت کے اسباب تو انسان کو معلوم ہیں بلکہ ماہرین طب کسی جاندار کے مرنے کے بعد بھی اس کی موت کے اسباب کا سراغ لگا لیتے ہیں۔ لیکن موت کے عمل کو روکنے میں وہ بھی بے بس ہیں۔ موت خواہ طبعی عمر پر پہنچنے کے بعد آئے، خواہ بیماری اس کا سبب ہو، خواہ ایک جاندار دوسرے جاندار کو کسی بھی طریقے سے ہلاک کر دے۔ موت اٹل حقیقت ہے۔ ہم آج بھی دیکھتے ہیں کہ اس ترقی یافتہ دَور میں بیماری کے خلاف ماہرین طب جنگ میں معروف ہیں اور بیماری سے زندگی کو محفوظ رکھنے کے لیے طب وجراحت میں نئی نئی ایجادیں ہوئی ہیں اور مزید ہو رہی ہیں لیکن آج تک موت کے عمل کو روکا نہیں جا سکا ہے اور نہ یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ تمام تر ترقی کے باوجود کوئی ایسا وقت آسکتا ہے کہ جب انسان موت کی دست برد سے قطعی نجات حاصل کرلے۔ بہرحال انسان موت کے آگے قطعی بے بس ہے۔ بالآخر ہم یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ جس خالقِ کائنات نے جانداروں کو تخلیق کیا موت بھی اس کے منشا اور حکم سے جانداروں پر تسلّط کرلیتی ہے اور دنیا کی کوئی انسانی طاقت مردہ انسان کو دوبارہ زندگی نہیں دے سکتی۔

موت بظاہر ایک بھیانک عمل نظر آتی ہے اور ایسا لگتا ہے کہ موت

کے بعد سب کچھ ختم ہو جاتا ہے لیکن دنیا میں جتنے بھی مذاہب موجود ہیں ان میں موت کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کا کوئی نہ کوئی تصور پایا جاتا ہے جو کہ بنیادی طور پر مشترک نظر آتا ہے۔ دراصل خالقِ کائنات نے انسان کو ارادے اور اختیار کی آزادی دے کر یوں ہی نہیں چھوڑ دیا بلکہ اس سے یہ تقاضا بھی کیا ہے کہ وہ اپنے اخلاقی وجود کا لحاظ رکھتے ہوئے شر سے بچے اور خیر کا راستہ اختیار کرے۔ اسے ایسے اخلاقی اصول اور اعمال اختیار کرنے چاہییں کہ کوئی انسان اپنے جیسے دوسرے انسان یا کسی جاندار پر ظلم نہ کرے اور انسان ایک دوسرے کے جان و مال اور عزت و آبرو کو نقصان نہ پہنچائیں۔ کیوں کہ انسان کو وسیع تر اختیارات دے کر اس دنیا میں بھیجا گیا ہے۔ اس وجہ سے اس پر یہ پابندی بھی عائد کرنا لازمی تھی کہ وہ اپنے اختیارات کا غلط استعمال نہ کرے۔ اس پابندی کا لازمی تقاضا ہے کہ انسان سے اس کے اعمال کا محاسبہ کیا جائے۔ لہٰذا یہ یقین رکھنا چاہیے کہ موت کے بعد معاملہ ختم نہیں ہو جائے گا بلکہ مرنے کے بعد دوبارہ زندگی ملے گی۔ اور اس میں انسانوں کو ان کی بد اعمالی کے حساب سے سزا دی جائے گی اور جو اچھے اعمال اس نے اپنی دنیوی زندگی میں اختیار کیے ہوں گے جن کے اختیار کرنے کی تعلیمات مذاہب نے دی ہیں ان کا بہت اچھا صلہ دیا جائے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں جتنی اچھائیاں اور برائیاں ہیں ان میں فرق کرنا ہمیں مذاہب نے سکھایا ہے۔ ہم مذاہب میں دی گئی اچھائیوں اور برائیوں کے فرق کو کسی بھی عقلی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھ لیں ہماری پوری طرح تشفی ہو جاتی ہے کہ جس عمل سے مذاہب نے ہمیں روکا ہے وہ عمل واقعی انسانی معاشرے کے لیے نقصان دہ ہے اور جس عمل کے اختیار کرنے کی مذاہب نے تعلیم دی ہے وہ عمل انسانی معاشرے کے لیے فلاحی عمل ہے۔ یہ باتیں دنیا کے تمام مذاہب میں مشترک ہیں۔

مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کے عقیدے کی روشنی میں انسانی اخلاق و کردار پر جو اثرات مرتب ہوتے ہیں اس کی تفصیل ہر مذہب میں کسی

نہ کسی صورت میں ہے۔ جیسا کہ مذہب نے تعلیم دی ہے اور اعمالِ خیر یعنی اچھے اعمال اور اعمالِ شر یعنی بُرے اعمال میں فرق واضح کر دیا ہے اور اس بات کو نہایت وضاحت کے ساتھ بتایا ہے کہ کسی انسان کا اچھا یا بُرا عمل خواہ وہ اسے کتنا ہی چھپ کر انجام دے، پیدا کرنے والے کی نظروں سے پوشیدہ نہیں ہوگا۔ کیونکہ ایک دن جب انسان مر جائے گا تو اسے اپنے اچھے اور بُرے اعمال کے صلے اور سزا کے مرحلے سے گذرنا ہوگا۔ اس کے لیے مختلف مذاہب نے سزاؤں کے مختلف طریقے بتائے ہیں کہ بُرے اعمال کے نتیجے میں اسے کیا سزا دی جائے گی۔ کہیں یہ سزا مسئلہ تناسخ کی شکل میں ہے کہ بُرے اعمال والے انسانوں کو مختلف جانوروں کے روپ میں یا انسان سے کم تر درجے کی شکل میں اس دنیا میں بھیجا جائے گا اور اسے اپنے اس جنم میں مصائب و آلام کا سامنا کرنا پڑے گا اور سزا بھگتنے کے بعد اس کو نجات ملے گی۔ کسی مذہب میں بُرے اعمال کے عوض دوزخ کی آگ میں جلائے جانے کا تصور ہے۔ بہر حال تمام مذاہب میں مرنے کے بعد اپنے اعمال کی سزا بھگتنے کا تصوّر مشترک ہے اور اسی طرح اچھے اعمال اختیار کرنے کے نتیجے میں انسان کو اچھا صلہ ملنے کا اظہار کیا گیا ہے۔

مرنے کے بعد زندگی کا عقیدہ ہمارے کردار اور اخلاق پر براہِ راست اثر انداز ہوتا ہے۔ اگرچہ ظاہری طور پر ہمارے پاس وہ قوت نہیں ہے جس سے ہم موت کے بعد کی زندگی دیکھ سکیں لیکن اس عقیدے کا اقرار ہماری موجودہ زندگی میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اگر ہم دنیا کی زندگی کو ہی سب کچھ سمجھ لیں اور سمجھیں کہ بس یہی زندگی سب کچھ ہے اس کے بعد کچھ نہیں ہے۔ تو ہمارا اخلاقی رویّہ یقینی طور پر غیر منظّم ہوگا جس سے نہ صرف انفرادی زندگی متاثر ہوگی بلکہ پورا معاشرہ درہم برہم ہو کر رہ جائے گا ایسی صورت میں نیکی کی تعریف محض دنیوی فائدے کے مترادف ہوگی اور بدی کو محض دنیوی نقصان تک محدود رکھا جائے گا۔

وہ شخص جو موت کے بعد کی زندگی پر یقین نہیں رکھتا وہ انتہائی

غیر ذمہ دار، مفاد پرست، ابن الوقت اور بے رحم ہو سکتا ہے۔ اس لیے کہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے اس کا اس سے جواب طلب کرنے والا کوئی ہے ہی نہیں اور جب انسان کو اس بات کا احساس ہو جائے کہ وہ ہر طرح سے آزاد ہے، اس کی کسی بات کا بھی محاسبہ نہیں ہوگا اپنی طاقت اور عقل کے بل بوتے پر وہ جو کچھ بھی کرے گا وہ اس کا حق ہے اور اس سے اس کی غلطیوں کے بارے میں کوئی پوچھے گا نہیں ایسی صورت میں وہ اچھے کاموں اور اعلیٰ اخلاق سے محروم ہو کر پورے معاشرے کے لیے وبالِ جان بن سکتا ہے اس کی ذاتی زندگی بھی تلخ ہو سکتی ہے اور وہ دوسروں کے لیے مکمل عذاب ثابت ہو سکتا ہے۔

وہ شخص جو موت کے بعد کی زندگی پر یقین رکھتا ہے اس میں خود بخود ذمہ داری کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ وہ نیکی اور اعلیٰ اخلاق کو زندگی کی اہم ضرورت تصوّر کرتا ہے۔ بُری باتوں، ظلم وستم، فریب، دھوکے، مکاری، ریاکاری اور جھوٹ سے گریز کرتا ہے۔ وہ اخلاق کی اعلیٰ قوت سے آگاہ ہوتا ہے اور معاشرے کا ایک انتہائی ذمہ دار شخص بن کر دوسروں کے دکھ درد میں شریک ہونا باعثِ عزت سمجھتا ہے۔ وہ موت کو زندگی کا اختتام نہیں سمجھتا بلکہ اسے ایک نئی زندگی کا آغاز تصوّر کرتا ہے۔ وہ دنیا کے آلام و مصائب، پریشانیوں اور مصیبتوں سے گھبراتا نہیں اور انتہائی صبر و سکون کے ساتھ ایک مطمئن اور خوش و خرم زندگی گذارتا ہے۔ وہ خوب سمجھتا ہے کہ دکھ و درد کی اہمیت کیا ہے۔ ایسا شخص معاشرے کی ذمہ داریوں کا ادراک رکھتا ہے۔ اس کی زندگی بذاتِ خود ایک انعام ہوتی ہے۔ وہ معاشرے کی خوبیوں اور خامیوں کو ذہن میں رکھتا ہے اور نیکی اور بھلائی کی قوتوں کی نشوونما کا ذریعہ بنتا ہے۔ وہ سزا کے خوف سے برے اعمال سے گریز کرتا ہے اور وہی اعمال اختیار کرتا ہے جن کے صلے میں اسے مرنے کے بعد دوبارہ زندگی ملنے پر اچھا اجر ملے گا اور کوئی فکر نہ ہوگی۔

یہ یاد رہے کہ تمام مذاہب کی روشنی میں اچھے اعمال وہ ہیں جن سے ایک انسان کو دوسرے انسان سے ہمدردی، محبت اور فائدہ حاصل ہوتا ہے اور برے اعمال وہ ہیں جن کے اختیار کرنے سے دوسرے انسانوں کی عزّت و آبرو اور جان و مال کو نقصان پہنچتا ہے۔ اگر دنیا میں بسنے والے انسان مرنے کے بعد دوبارہ زندگی ملنے اور جزا و سزا کے عمل سے گزرنے پر پختہ یقین رکھیں تو وہ ہر ممکن طور پر اچھے اعمال اختیار کرنے اور برے اعمال سے بچنے کی کوشش کریں۔

مشق

۱۔ ترقّی کرنے اور آگے بڑھنے کے سلسلے میں انسان اور حیوان میں کیا فرق ہے؟

۲۔ موت کے بعد نئی زندگی سے کیا مراد ہے؟

۳۔ وہ لوگ جو موت کے بعد زندگی پر ایمان نہیں رکھتے، ہمارے معاشرے میں ان کا کیا مقام ہوتا ہے؟

۴۔ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کے عقیدے کی روشنی میں انسانی اخلاق و کردار پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں؟

۵۔ اچھے اعمال اور برے اعمال سے کیا مراد ہے؟

۶۔ صحیح جواب کا انتخاب کرکے خالی جگہ پر کیجیے۔

(الف) انسان کی سب سے بڑی مجبوری ــــــــ ہے۔ (موت کا عمل، زندگی)

(ب) انسان موت کے عمل کو روکنے میں ــــــــ ہے۔ (قادر، بے بس)

(ج) موت ایک ــــــــ حقیقت ہے۔ (بے ضرر، اٹل)

(د) حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں جتنی اچھائیاں اور برائیاں ہیں ان میں ــــــــ ہمیں مذاہب نے سکھایا۔ (اصول، فرق)

(ہ) مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کے عقیدے کی روشنی میں انسانی اخلاقی کردار پر جو ــــــــ ہوتے ہیں اس کی تفصیل ہر مذہب میں کسی نہ کسی صورت میں ہے۔ (خوف، اثرات)۔

شرافتِ حقیقی

میں پوچھتا نہیں ہرگز تمھارا نام ہے کیا
نہ یہ کہ نام بزرگوں کا اور مقام ہے کیا
نہ خانوادے سے مطلب نہ خانماں سے غرض
یہاں تو نام سے کچھ ہے نہ ہے نشاں سے غرض

تمھارے کام گر اچھے تو نام اچھے ہیں
گھرانے اچھے گھر اچھے تمام اچھے ہیں

جہاں کی دولت و حشمت کا یاں خیال نہیں
امیر ہو کہ فقیر اس سے کچھ سوال نہیں
کوئی اگر ہے تونگر تو اپنے گھر بیٹھے
بزرگ صاحبِ زر ہے تو لے کے زر بیٹھے

یہاں تو مایۂ ہمّت میں جو زیادہ ہے
بزرگ امیر ہیں اور خود امیر زادہ ہے

میں پوچھتا نہیں تاجر کہاں سے ہے آیا
گماشتہ ہے کہ رکھتا ہے گھر کا سرمایا
میں چاہتا نہیں ارزاں یہ شے دلا دو مجھے
خدا کے واسطے اتنا کوئی بتا دو مجھے

متاعِ حسنِ دیانت دکاں میں ہے کہ نہیں
وفا کی جنس بھی اس کارواں میں ہے کہ نہیں

مجھے غرض نہیں کالج میں تم پڑھے کہ نہیں
جماعتوں کے مدارج پہ تم چڑھے کہ نہیں

کتابیں پڑھ کے جو کیں حفظِ برزباں تو کیا
اور ان سے پاس ہوئے دے کے امتحاں تو کیا
تمہارے خُلق پہ بھی کچھ اثر ہوا کہ نہیں
زباں سے کہنے کی دل تک گئی صدا کہ نہیں
جو کچھ منہ سے کہو اس کا لو اثر دل میں
کہ ہے کتابوں میں جو کچھ کرے وہ گھر دل میں
زبان و دل ہیں بہم جب کہ ایک ہو جاتے
تو آدمی بھی ہیں بالطبع نیک ہو جاتے
دگرنہ پڑھنے کو سب خاص و عام پڑھتے ہیں
ہزاروں طوطے ہیں کلمہ کلام پڑھتے ہیں

(محمد حسین آزاد)

مشق

۱۔ شرافتِ حقیقی سے شاعر کی کیا مراد ہے؟
۲۔ وہ کون سی باتیں ہیں جن سے انسان کا مرتبہ بلند ہوتا ہے؟
۳۔ زبان و دل کس طرح ایک ہوتے ہیں؟
۴۔ "دگرنہ پڑھنے کو سب خاص و عام پڑھتے ہیں
ہزاروں طوطے ہیں کلمہ کلام پڑھتے ہیں"
اس شعر میں شاعر نے کیا کہا ہے؟
۵۔ اس نظم کے مرکزی خیال کو مختصر طور پر بیان کیجیے۔

دوسروں کی جان ومال اور عزت کا احترام

ہر مہذب معاشرے میں ہر انسان کی جان ومال اور عزت وآبرو کا احترام لازمی حیثیت رکھتا ہے۔ دنیا کے تمام مذاہب میں اسے ایک قدرِ مشترک کی حیثیت حاصل ہے کہ تمام انسان ایک دوسرے سے ہمدردی اور محبت کا سلوک کریں۔ ایک دوسرے کے حقوق کا احترام کریں اور ایک دوسرے کو نہ تو ایذا پہنچائیں اور نہ ایک دوسرے کے مال کو نقصان پہنچائیں۔ مذاہب نے انسانوں کے انھی اچھے اعمال کو خیر کا عمل کہا ہے۔ اس کے برخلاف ایسا عمل جو دوسرے انسان کی جان ومال اور عزت وآبرو کے لیے نقصان دہ ہو، شر کہلاتا ہے۔

دوسروں کو دکھ دینا، ان کی بے عزتی کرنا، انھیں نقصان پہنچانا بری عادتیں ہیں۔ ایسا آدمی کبھی خوش نہیں رہ سکتا۔ اُسے ایک لمحہ کے لیے بھی سکون نہیں ملتا جو دوسروں کو نقصان پہنچانے اور دکھ دینے میں اپنی ساری قوتیں صرف کرتا ہے۔ وہ نہایت گھاٹے میں رہتا ہے۔ ایک تو یہ کہ ایسے آدمی سے ہر شخص نفرت کرتا ہے۔ کوئی بھی اسے اچھا نہیں سمجھتا۔ جب اس پر کوئی مصیبت آپڑتی ہے تو کوئی بھی اس کی مدد نہیں کرتا۔ دوسرے ایسا ظالم آدمی اپنی بھلائی کے لیے بھی کچھ نہیں کر پاتا اس کی اپنی زندگی عذاب میں گزرتی ہے۔

اچھے شہری اس بات سے بخوبی واقف ہوتے ہیں کہ ان کے کیا فرائض ہیں۔ ان کو اپنے پڑوسیوں سے کس طرح پیش آنا چاہیے۔ کمزوروں اور ناداروں کی کس طرح مدد کرنی چاہیے۔ ضرورت پڑنے پر دوسروں کے جان ومال اور عزت کا احترام کس طرح کیا جانا چاہیے۔ دراصل کسی انسان کی مدد کرنا پورے معاشرے کی مدد کرنے کے مترادف ہے اور کسی انسان کو تباہ کرنے یا دکھ دینے کا مطلب ہے، اس معاشرے کو تباہ کرنا یا دکھ دینا۔ ہم سب بھائی بھائی ہیں۔ حضرت آدم کی اولاد ہیں۔ بلا امتیاز رنگ ونسل سب کو ایک دوسرے کا خیرخواہ اور

ہمدرد ہونا چاہیے۔ اپنے بھائی کے لیے بھی وہی چیز پسند کریں جو ہم اپنے لیے پسند کرتے ہیں۔

ہر شخص کو اپنی جان، اپنی آبرو اور اپنا مال پیارا ہوتا ہے۔ اسے سمجھنا چاہیے کہ دوسروں کو بھی اپنی جان، اپنا مال اور اپنی عزت عزیز ہے۔ لہٰذا اسی طرح اسے دوسروں کی جان و مال اور عزت کا احترام کرنا چاہیے۔ جو لوگ اس بات پر عمل نہیں کرتے وہ اس بات کو نہیں سمجھتے کہ وہ اپنا ہی نقصان کرتے ہیں۔

جو لوگ دوسروں کا مذاق اڑاتے ہیں حقارت اور نفرت سے دوسروں پر ہنستے ہیں یا دوسروں پر حسد کرتے ہیں وہ اخلاقی اعتبار سے بڑی گھٹیا حرکت کرتے ہیں۔ وہ نہیں چاہتے کہ دوسرے آرام اور سکون کی زندگی گذاریں اس لیے وہ یہ چاہتے ہیں کہ وہ اس حال میں نہ رہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ان میں ہمدردی اور محبت کا جذبہ ختم ہو جاتا ہے۔ وہ اعتدال پسند نہیں رہتے، انتہا پسند ہو جاتے ہیں اور دوسروں کی جان و مال اور عزت کا احترام ان کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ ایسے لوگ معاشرے میں خرابی کا سبب بنتے ہیں۔ ایک دوسرے کے مال کو ناجائز طریقوں سے حاصل کرنے، چوری اور چالاکی سے تباہ کرنے، لوٹ کھسوٹ کے ذریعے حاصل کرنے کا عمل ناجائز اور ناپسندیدہ ہے۔ اور دوسروں کے مال کی پامالی اور بے حرمتی بھی ہے۔ ایسے انسان جھوٹ بھی بولتے ہیں۔ ریاکاری اور عیاری سے کام لیتے ہیں۔ ان کے ضمیر مردہ ہو جاتے ہیں۔ ان کے اخلاق اور کردار میں نیکی، پرہیزگاری، پاکیزگی نہیں ہوتی۔

ہر انسان کی یہ فطری خواہش ہوتی ہے کہ معاشرے میں اس کی عزت کی جائے۔ اس کے جان و مال کا تحفظ ہو اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ انسان اپنے مفاد سے ہٹ کر سوچے اور اجتماعی فلاح کو اپنی نظر میں رکھے۔ دوسروں کی عزت اور آبرو کو اپنی عزت اور آبرو تصور کرے۔ اگر ہر شخص خود غرضی، مفاد پرستی، ہوس اور لالچ سے گریز کرے تو ایک بہتر معاشرہ وجود میں آسکتا ہے۔

ہم سب کا فرض ہے کہ ہم اجتماعی طور پر ایک دوسرے کی جان و مال اور آبرو کے تحفظ کا خیال رکھیں۔ ایک دوسرے کی مدد، فائدے اور فلاح کا خیال رکھیں ہر اچھے

اور نیک کام میں ایک دوسرے کی مدد کریں اور بُرے کاموں سے روکیں۔ ہمارے ہر عمل کی بنیاد سچائی، محبّت، خلوص اور بھائی چارے پر ہو۔ ہم انسانیت کے اصولوں کا احترام کرنا سیکھیں۔ دوسروں کے دکھ درد بانٹیں۔ اپنی اخلاقی قدروں کو بلند کریں۔ خلوص اور ہمدردی کے ساتھ ایک بہتر معاشرے کی تشکیل کریں جس میں ہر انسان دوسرے کی جان و مال اور عزّت کا احترام کرنا فخر کی بات سمجھے۔

مشق

۱۔ خیر اور شر کے اعمال سے کیا مراد ہے؟
۲۔ جو لوگ دوسروں کی جان و مال اور عزّت کا احترام نہیں کرتے معاشرے میں ان کا کیا مقام ہوتا ہے؟
۳۔ حسد کرنے والوں کا کیا انجام ہوتا ہے؟
۴۔ ہر انسان کی فطری خواہش کیا ہوتی ہے؟
۵۔ ایک بہتر معاشرے کی تخلیق کے سلسلے میں ہمیں کیا کردار ادا کرنا چاہیے۔

خوش خُلقی

زندگی تو سب ہی گذار تے ہیں۔ انسان بھی اور حیوان بھی، لیکن ان دونوں کی زندگی میں ایک نمایاں فرق ہے۔ وہ لوگ جو آدابِ زندگی سے واقف نہیں ان کی زندگی حیوانی زندگی سے زیادہ نہیں ہوتی۔ انسانی زندگی کو بہتر طور پر گذارنے کے لیے کچھ اصول اور قواعد و ضوابط ہیں۔ ان پر عمل کرنے کے بعد ہی ہم ایک بہتر زندگی کا تصوّر کر سکتے ہیں۔ ان ضابطوں میں خوش خلقی بڑی اہم ہے۔ کوّے اور کوئل میں رنگ و روپ میں اتنا زیادہ فرق نہیں لیکن کوّے کو کوئی پسند نہیں کرتا جب کہ کوئل کو سب پسند کرتے ہیں۔ انسان چونکہ اشرف المخلوقات میں سے ہے وہ اپنی عقل کی بدولت اپنے مشاہدوں کی روشنی میں اس بات کا اندازہ آسانی سے کر سکتا ہے کہ کون سی بات کس انداز اور لہجے میں کہی جانی چاہیے اور جب وہ قاعدوں اور ضابطوں کی روشنی میں گفتگو کرتا ہے تو اس کا اثر بھی اسی انداز سے ہوتا ہے۔ ان اصولوں میں متانت، سنجیدگی اور خوش اخلاقی کو بڑا دخل ہے۔

خوش اخلاقی سے مراد اچھی عادات کا مظاہرہ ہے۔ اس کا دائرہ تمام انسانی تعلّقات تک وسیع ہے۔ اس میں دوسروں کے ساتھ بات چیت اور میل جول میں اچھے طور وطریق اختیار کرنے کے علاوہ مروت، تعاون اور ایثار کے رویے بھی شامل ہیں۔ غرض خوش خلقی دوسروں کے ساتھ حسنِ سلوک کے تمام اطوار کا مجموعہ ہے۔ وہ لوگ جو دوسروں کے ساتھ خوش خلقی سے پیش آتے ہیں ان کے لہجے میں نرمی، شیرینی اور خنداں پیشانی خود بخود پیدا ہو جاتی ہے۔ سختی اور بد زبانی یوں بھی انسان کے ذہن کو پراگندہ کرتی ہے۔ جس سے بات کی جاتی ہے اگر کمزور یا ماتحت ہے تو وہ دل ہی دل میں کڑھتا ہے۔ جی مسوس کر رہ جاتا ہے۔ مُخاطِب

ہونے والے سے وہ اگر کچھ نہیں کہہ پاتا لیکن اس کے چہرے کے تاثرات اس امر کی غمازی کرتے ہیں کہ اسے یہ اندازِ تخاطب بالکل پسند نہیں آیا۔ بد زبانی اس سے بھی بڑی لعنت ہے۔ جو لوگ زبان کا صحیح استعمال نہیں کرتے وہ اپنی بات بہتر طور پر سمجھا بھی نہیں سکتے۔ اس لیے کہ جہاں تلخی پیدا ہو جاتی ہے وہاں انسان کا ذہن کسی بات کو آسانی سے سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔

جو لوگ خوش خلق نہیں اور بد زبانی کو اپنی عادت بنا لیتے ہیں وہ ذہنی طور پر خود بھی پریشان اور الجھے ہوئے رہتے ہیں اور دوسروں کے لیے بھی پریشانی کا سبب بن جاتے ہیں۔ معاشرے میں انھیں کوئی مقام نہیں ملتا۔ لوگ ان سے ملنے اور ان کی بات سننے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ اس کی ہر راہ غرور اور تکبّر کی طرف جاتی ہے۔

خوش کلامی دراصل خوش اخلاقی ہے۔ اور خوش اخلاق انسان مطمئن اور خوش و پُرسکون رہ کر معاشرے میں بلند مقام حاصل کرتا ہے۔ سب لوگ اس کی عزّت کرتے ہیں۔ خوش خلقی خدا کی دی ہوئی نعمتوں میں سے ایک بڑی نعمت ہے۔ یہ انسان کو بھٹکنے سے بچا لیتی ہے۔ یہ انسان میں حوصلہ اور جذبہ پیدا کرتی ہے۔ اس سے انسان کا وقار بڑھتا ہے۔ خوش خلق انسان ریاکاری سے بھی بچتا ہے۔ وہ نڈر بھی ہوتا ہے اور ہر جگہ سچائی کا اظہار کرنے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ وہ کیوں کہ کسی کا دل توڑنا مناسب نہیں سمجھتا، کسی کو دکھ دینا نہیں چاہتا اور اپنے اخلاق سے، اپنی گفتگو سے، اپنے مخصوص انداز سے وہ لوگوں کے دلوں کو موہ لیتا ہے اس لیے اس کا کوئی دشمن بھی نہیں ہوتا۔ ہر مذہب میں، ہر مہذّب معاشرے میں خوش خلقی اہم رہی ہے۔ بڑے بڑے بزرگوں، رشیوں، منیوں اور پیغمبروں نے خوش خلقی کو ہمیشہ اپنا شعار بنایا۔ لوگوں کو پہلی نصیحت یہی کی اور عملی طور پر اپنی زندگی کو نمونہ بنا کر اس کی اہمیت کو اجاگر کیا۔

خوش خلقی سے انسان ایک دوسرے کے قریب آتے ہیں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ لوگوں میں آپس میں اختلاف ہوتے ہیں۔ لیکن انسانیت کے تقاضے کے تحت وہ خوش خلقی سے پیش آتے ہیں اس طرح انھیں ایک دوسرے کو

قریب سے سمجھنے کا بہتر موقع ملتا ہے اور ایک دوسرے کے متعلق غلط فہمیاں اگر ہوتی ہیں تو وہ دور ہوجاتی ہیں اور آپس میں محبّت اور ہمدردی سے تعلقات خوشگوار ہوجاتے ہیں۔ سلام میں پہل کرنا، شکریہ ادا کرنا، ایک دوسرے کی خیریت معلوم کرنا۔ دکھ، درد میں شریک ہونا اور ایک دوسرے کے لیے دعائیہ جملے ادا کرنا معیاری اخلاق کی مثال ہیں۔ اس سے دلوں کی کدورت دور ہو جاتی ہے اور بہتر تعلّقات پیدا ہوجاتے ہیں۔

مشق

۱۔ خوش خلقی سے کیا مراد ہے؟

۲۔ خوش خلق انسان میں کیا کیا خوبیاں ہوتی ہیں؟

۳۔ بد اخلاق اور بد زبان لوگوں کا کیا حال ہوتا ہے؟

۴۔ خوش خلق انسان کس طرح لوگوں کے دلوں کو موہ لیتا ہے؟

۵۔ جو لوگ ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک نہیں ہوتے، الگ تھلگ رہتے ہیں۔ اور جب بولتے ہیں تو بد زبانی کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے بارے میں آپ کے کیا خیالات ہیں؟

۶۔ خوش خلقی پر دو پیراگراف لکھیے۔

کسبِ حلال

جائز طریقوں سے روزی حاصل کرنے کو کسبِ حلال کہتے ہیں۔ اپنے ہاتھ سے کام کرنے میں کوئی عار نہیں ہونا چاہیے۔ دوسروں کی محتاجی سے بچنے اور اپنی پسند کے مطابق کام کرنے کا واحد طریقہ یہی ہے کہ محنت کرنے میں فخر محسوس کیا جائے۔

زراعت ہو یا تجارت، ہنر ہو یا نوکری شرط یہی ہے کہ جائز طریقے سے اپنی روزی حاصل کی جائے۔ جو لوگ تن آسان ہوتے ہیں اور محنت سے جی چراتے ہیں وہ زندگی کے ہر شعبے میں ناکام رہتے ہیں۔ کام چوری کی وجہ سے انھیں معاشرے میں کوئی مقام نہیں ملتا۔ زندگی کی بہرحال بہت سی ضرورتیں ہیں جن کا پورا کرنا ضروری ہوتا ہے۔ جو لوگ محنت سے جی چراتے ہیں وہ اپنی یہ ضرورتیں پوری نہیں کرسکتے اور پھر ناجائز طریقوں کو اپنانے میں لگ جاتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ بغیر محنت کیے زیادہ سے زیادہ کمائیں۔ ایسا کرنے میں انھیں جو ذلتیں برداشت کرنی پڑتی ہیں وہ ایک غیرت مند کبھی برداشت نہیں کرسکتا۔

حلال کی ضد حرام ہے یعنی ناجائز طریقوں سے اپنی روزی حاصل کرنا۔ حرام کا تصوّر نہایت واضح ہے اور ہر مذہب میں اس کے بارے میں کچھ نہ کچھ تفصیل موجود ہے۔ ایسی روزی جس میں محنت نہ کی گئی ہو اور ناجائز طریقے سے حاصل کی گئی ہو اس سے دل کو کبھی سکون نہیں ملتا۔ دل میں ایک خلش بھی رہتی ہے۔ ذہن پر بوجھ سا رہتا ہے۔ ہر وقت ندامت سے گردن جھکی رہتی ہے۔ لوگوں کی لعنتیں الگ۔ معاشرے میں ان کی عزت نہیں ہوتی۔ ان کی خیرات یا نیکی کے کاموں کو بھی قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا اس لیے کہ لوگ جانتے ہیں کہ جو کچھ اس نے کمایا ہے، وہ ناجائز طریقوں سے کمایا ہے۔

خوراک کا اثر نہ صرف انسان کی جسمانی نشوونما پر ہوتا ہے بلکہ اس کے اخلاق

داعمال پر بھی پڑتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ حرام روزی سے گریز کیا جائے۔ کم تولنا، دوسروں کو دھوکا دے کر دولت حاصل کرنا، بغیر محنت کے ناجائز طریقے سے روزی کمانا اخلاقی برائی اور لعنت تو ہیں ہی لیکن ایسا آدمی اپنی نظروں میں خود بھی گر جاتا ہے اور جب وہ تنہائی میں سنجیدگی سے سوچتا ہے تو اسے خود سے نفرت ہونے لگتی ہے۔

ہر معاشرے کے کچھ نہ کچھ اصول ہوتے ہیں۔ کچھ نہ کچھ اخلاقی اقدار ہوتی ہیں۔ معاشرے میں اطمینان و سکون اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب معاشرے کے افراد محنت کی عظمت کو سمجھ لیں اور حلال روزی کی اہمیت کا احساس ان کے دل میں مقام حاصل کر چکا ہو۔ وہ لوگ جو کسبِ حلال کو اہمیت دیتے ہیں ذہنی طور پر بہت پُرسکون ہوتے ہیں اور انھیں اس بات کا احساس خوشی بخشتا ہے کہ وہ جو کچھ کھا رہے ہیں وہ ان کی محنت کا پھل ہے۔ ایسے لوگ ہمیشہ خوش و خرّم رہتے ہیں۔ ایک بات یہ کہ جو لوگ محنت سے روزی کماتے ہیں وہ فضول خرچ نہیں ہوتے۔ وہ جانتے ہیں کہ انھوں نے کتنی محنت کے بعد یہ پیسے حاصل کیے ہیں۔ اگر ان کو یوں فضول خرچی میں صرف کر دیا گیا تو ان کو اور زیادہ محنت کرنی پڑے گی۔ ایسے لوگ نام و نمود اور نمائش کو بھی پسند نہیں کرتے۔ نہایت سادگی سے زندگی گذارتے ہیں۔ جہاں ہمیں دولت کی فراوانی اور نام و نمود کی نمائش میں بے اعتدالی نظر آئے وہاں یقینی طور پر ناجائز ذرائع سے آمدنی حاصل کی جاتی ہے۔ ناجائز ذرائع حاصل کرنے کے لیے انسان کو خوشامد پسند، جھوٹا اور منافق بننا پڑتا ہے جو اخلاقی طور پر بہت بڑی برائی ہیں۔ ان چیزوں سے بچنے کے لیے قناعت اور شکر کے ساتھ رزقِ حلال کی کوشش کرنی چاہیے۔ یہاں تک کہ وہ مال بھی نہیں لینا چاہیے جس کے بارے میں یہ شک ہو کہ وہ حلال ہے یا حرام ہے۔

کسبِ حلال فرد کے اخلاق کی تعمیر میں ممدّ و معاون ثابت ہوتا ہے۔ اجتماعی طور پر بھی معاشرے میں سکون و اطمینان، برکتیں اور معاشی توازن قائم ہوتا ہے۔ وہ شخص جو رزق حلال کماتا ہے وہ کسی سے بھی خوف نہیں کھاتا، امانت و دیانت اس کی عادت بن جاتی ہے۔ اس لیے بھی کہ اسے محنت کی کمائی کا شدید احساس

ہوتا ہے اس طرح وہ سادگی اختیار کرتا ہے اور نیک و صالح بن جاتا ہے۔ اس طرح اس کے اچھے کردار کی تعمیر ہوتی ہے اور اسے اخلاقی اور روحانی اطمینان وسکون بھی ملتا ہے اور اس کے ذریعے معاشی ومعاشرتی توازن بھی قائم ہوتا ہے۔

مشق

۱۔ حرام اور حلال کے فرق کی وضاحت کیجیے۔

۲۔ جو لوگ حلال طریقے سے روزی نہیں کماتے معاشرے میں ان کا کیا مقام ہے؟

۳۔ کسبِ حلال فرد کے اخلاق کی تعمیر میں کس طرح ممد ومعاون ثابت ہوتا ہے؟

۴۔ ذیل کے جملوں کو پڑھیے اور جواب میں صحیح یا غلط لکھیے۔

(الف) حلال کی ضد حرام ہے۔

(ب) ہر معاشرے میں نہ کچھ اصول ہوتے ہیں نہ اخلاقی اقدار۔

(ج) کم تولنا، دوسروں کو دھوکا دینا، ناجائز طریقے سے روزی کمانا اخلاقی برائی نہیں ہے۔

(د) جو لوگ محنت سے روزی کماتے ہیں وہ فضول خرچ نہیں ہوتے۔

(ہ) ناجائز ذرائع سے روزی کمانے والا اچھا آدمی ہوتا ہے۔

عزّتِ نفس

اس دنیا کو پیدا کرنے والے کا کوئی حکم فطرت کے خلاف نہیں۔ عزّتِ نفس یعنی اپنی عزّت، مرتبہ اور حیثیت کی حفاظت کرنا انسان کا فطری عمل ہے۔ اسے ہم خود داری بھی کہہ سکتے ہیں۔ خود داری یعنی اپنے آپ کو پہچاننا اور اپنی ذات کو پہچاننے کے بعد اس کی مکمّل طور پر حفاظت کرنا۔ دنیا میں بہت سی ایسی چیزیں بھی ہیں جو انسان کو تن آسانی کی طرف مائل کرتی ہیں۔ اس میں جو شخص ان کا اثر قبول کرلیتا ہے اس میں تعمیری جذبہ سرد پڑ جاتا ہے اور ہوس کا جذبہ بیدار ہو جاتا ہے۔ ایسا شخص اپنی عزّتِ نفس کو محفوظ نہیں رکھ پاتا۔ اور جب عزّتِ نفس مجروح ہو جائے تو انسان کے لیے یہ دنیا رہنے کی جگہ نہیں رہتی۔ شرافت اور وقار انسان کی عین فطرت ہے لیکن اس کا مطلب غرور ہرگز ہرگز نہیں ہے۔ غرور تو اپنے بارے میں غلط اندازے لگانے کا نام ہے۔ مغرور انسان اصل میں اپنی حیثیت اور وقار کو صحیح معنوں میں سمجھتے ہی نہیں ہیں۔ اپنی اس غلطی کا وہ بہت جلد نتیجہ بھی بھگتتے ہیں۔ اس لیے عزّتِ نفس یا خود داری غرور و تکبّر سے ایک الگ چیز ہے۔ اپنی ذات کے مرتبے کو جاننے اور اپنی شخصیت کی تکمیل کرنا اصل زندگی ہے۔ عزّت کیا ہے؟ عزّت کیسے کی جاتی ہے اور ہمیں باوقار زندگی گزارنے کے لیے اپنا احترام کس طرح کرنا چاہیے؟ ہمیں جب اس بات کا احساس اور ادراک ہو جاتا ہے تو پھر زندگی خود بخود سنور جاتی ہے۔

عزّتِ نفس کا اظہار وقار، سنجیدگی، متانت، تہذیب اور شائستگی جیسی اخلاقی خوبیوں سے ہوتا ہے۔ جو شخص ان خوبیوں سے محروم ہوتا ہے اسے لوگ اچھی نظر سے نہیں دیکھتے۔ اس کا لوگوں کے ساتھ برتاؤ، عام گفتگو، غیر مہذّب رویّہ، اس کے لباس کی غیر شائستگی اسے معاشرے میں ناپسندیدہ بنا دیتی ہے اور وہ معاشرے پر بوجھ

ہوتا ہے۔ اپنی عزتِ نفس کا خیال رکھنے والے اپنی عام زندگی میں بھی پُر وقار، سنجیدہ اور پُر خلوص ہوتے ہیں۔ ان کے پاکیزہ خیالات، نیک طور طریق اور میانہ روی دوسرے لوگوں پر اچھے اثرات مرتب کرتی ہے۔ سب ان سے خوش رہتے ہیں۔ ان کی عزت کرتے ہیں۔ انھیں معاشرے میں ایک باعزت مقام ملتا ہے۔ ایسے لوگوں کی اخلاقی خوبیاں نہ صرف ان کی زندگی کو صراطِ مستقیم پر چلاتی ہیں بلکہ دوسرے لوگوں کے لیے بھی ایک نمونہ ہوتی ہیں۔

جو لوگ خود دار ہوتے ہیں وہ دوسرے لوگوں کے جذبات اور احساسات کا خیال رکھتے ہیں۔ وہ تکبّر، تکلّف، تصنّع اور نام و نمود کی پروا نہیں کرتے۔ ان کا خلوص اور ان کی ہمدردی کا جذبہ ان کے کردار کو بلند کرتا ہے۔ وہ غریب، مفلس، کمزور اور نادار لوگوں کی مدد کر کے خوش ہوتے ہیں۔ ان کا حوصلہ بلند ہوتا ہے۔

عزتِ نفس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انسان اپنی ذات میں گم ہو جائے۔ اصل کمال تو یہ ہے کہ انسان تمام معاشرتی تعلقات کی موجودگی میں بھی اپنی انفرادیت برقرار رکھے اور کسی خوف یا لالچ کی وجہ سے اپنی عزت پر کوئی حرف نہ آنے دے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ خود باوقار انداز اختیار کرے اور دوسروں کی عزت و احترام کا بھی لحاظ رکھے۔

خودداری انسان کا ایک بڑا وصف ہے۔ خود دار انسان جھوٹ، مکّاری، دھوکا بازی اور ریاکاری سے نفرت کرتا ہے۔ وہ سادگی پسند ہوتا ہے اور اپنے ہاتھ سے کام کرنے میں فخر محسوس کرتا ہے۔ اس کے اخلاق میں بردباری ہوتی ہے۔ اس کے جذبے میں ہمدردی اور محبت نمایاں ہوتی ہے۔ وہ محنت کی عظمت کے مفہوم کو زیادہ بہتر طور پر سمجھتا ہے۔ اعتدال پر قائم رہنے اور نیک عمل مسلسل کرنے سے اسے ایک روحانی سکون ملتا ہے۔ اس کے نفس کی پاکیزگی اسے اشرف المخلوقات میں شامل کر دیتی ہے۔ ہر خود دار انسان بڑوں کی عزت کرتا ہے، چھوٹوں سے محبّت اور شفقت سے پیش آتا ہے۔ دوسروں کے دکھ درد میں شامل ہو کر خوش ہوتا ہے۔ والدین کی خدمت کرنے میں فخر محسوس کرتا ہے۔ ان کی عزت کرتا ہے۔ رشتہ داروں اور پڑوسیوں سے نہایت رحم دلی کے ساتھ پیش آتا ہے۔ استقلال اور استقامت اس کی زندگی کا حصہ بن جاتے ہیں۔

مشق

۱۔ عزّتِ نفس کا اظہار کن باتوں سے ہوتا ہے؟
۲۔ خود دار انسان میں کیا کیا خصوصیات ہوتی ہیں؟
۳۔ جو لوگ مغرور ہوتے ہیں ان کا معاشرے میں کیا مقام ہوتا ہے؟
۴۔ جو لوگ اعتدال سے کام لیتے ہیں وہ دوسرے لوگوں کے جذبات اور احساسات کا احترام کس طرح کرتے ہیں؟
۵۔ اپنے دوست کو ایک خط لکھیے جس میں عزّتِ نفس کی وضاحت کیجیے۔

محنت کی برکتیں

وہی لوگ پاتے ہیں عزّت زیادہ
جو دنیا میں کرتے ہیں محنت زیادہ

اسی میں ہے عزت، خبردار رہنا
بڑا دکھ ہے دنیا میں بیکار رہنا

بڑائی بشر کو اسی سے ملی ہے
نکمّی جو گذرے، وہ کیا زندگی ہے

زمانے میں عزّت، حکومت یہی ہے
بڑی سب سے دنیا میں دولت یہی ہے

گڈریوں کو شاہنشہی اس نے دی ہے
کوملبس کو دنیا نئی اس نے دی ہے

ہری کھیتیاں جو نظر آ رہی ہیں
ہمیں شان محنت کی دکھلا رہی ہیں

نہیں کرتے دنیا میں نادان محنت
جو سمجھیں تو سونے کی ہے کانِ محنت

اسی سے زمانے میں دولت بڑھے گی
جو دولت بڑھے گی تو عزت بڑھے گی

جو محنت نہ ہوتی، تجارت نہ ہوتی
کسی قوم کی شان و شوکت نہ ہوتی

سہارا ہمارا تمھارا یہی ہے
اندھیرے گھروں کا اجالا یہی ہے

جو ہاتھوں سے اپنے کمایا، وہ اچھا
جو ہو اپنی محنت کا پیسہ، وہ اچھا

مری جان غافل نہ محنت سے رہنا
اگر چاہتے ہو فراغت سے رہنا

(خواجہ الطاف حسین حالیؔ)

مشق

۱- محنت سے کیا کیا فائدے ہیں؟

۲- جو محنت نہیں کرتے ان کا کیا انجام ہوتا ہے؟

۳- پانچویں شعر میں شاعر نے کن واقعات کی طرف اشارہ کیا ہے۔

۴- "اندھیرے گھروں کا اجالا یہی ہے" سے شاعر کی کیا مراد ہے؟

۵- محنت کو سونے کی کان کیوں کہا جاتا ہے؟

منظّم رویّہ

ہر شخص کی زندگی کی قدر و قیمت اور معیار کا اندازہ اس کے رویّے یا کردار سے ہوتا ہے جو شخص لوگوں سے جتنا زیادہ حسن سلوک سے پیش آئے گا اتنا ہی وہ معاشرے میں بہتر کردار ادا کر سکے گا۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہر شخص کے لیے ممکن نہیں کہ ایک اعلیٰ سائنس دان بنے، مفکر یا سیاست دان بن سکے۔ لیکن یہ ضرور ممکن ہے کہ وہ خوش اخلاق، مہربان، منکسر المزاج، ہمدرد، خلیق اور بردبار بن جائے۔ یہ وہ اوصاف ہیں جنھیں آسانی سے اپنایا جا سکتا ہے۔

ہر معاشرے میں ایک فرد دوسرے فرد پر محض اپنے اعلیٰ اخلاق، حُسنِ سلوک اور راست بازی ہی کی وجہ سے فوقیت رکھتا ہے۔ جس کے اخلاق جتنے اچھے ہوں گے وہ معاشرے کی تشکیل میں اتنا ہی بہتر اور معاون ثابت ہوگا۔ ہر شخص کا دوسروں سے کسی نہ کسی انداز سے واسطہ پڑتا رہتا ہے اور اس کو اپنے تعلّقات کو قائم رکھنے کے لیے ایک حکمت عملی اختیار کرنی پڑتی ہے جس سے اس کا کردار یا رویّہ ظاہر ہوتا ہے۔ معاشرے میں وہی شخص نمایاں اور قابلِ تعریف ہے جو اپنے رویّے کو منظم رکھتا ہے۔

منظم رویّے سے مراد ہے کہ انسان کو ہر موقع پر اس کے حسبِ حال اخلاقی طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیے۔ موقع خوشی کا ہو یا غم کا بلکہ معاملہ اختلاف رائے کا ہو یا مخالفت کی شدید صورت ہی کیوں نہ ہو معاشرہ ہر موقع کے لیے کچھ قواعد و ضوابط رکھتا ہے۔ منظم رویّے کا تقاضا یہ ہے کہ انسان موقع کی مناسبت سے خود بخود ضروری قواعد و ضوابط کا انتظام کرے۔ انسان کی طینت اس قسم کی ہوتی ہے کہ وہ ایک حالت میں نہیں رہتا۔ اسے مختلف کام کرنے پڑتے ہیں۔ ہر کام کے متعلق یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ اس کے بارے میں ہمارا دل کیا کہتا ہے۔ بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ ہمیں کرنا کیا

ہے اور یہی بات سچی خوشی کی ضمانت ہے۔

خدا نے انسان کو اس جہان میں اشرف المخلوقات بنایا ہے۔ لیکن یہ شرف اس کی کوشش پر منحصر ہے کہ اس کا رویہ کیا ہے۔ انسان کا رویّہ اس کی اچھی صفات کی وجہ سے منظم ہوتا ہے۔ جس شخص میں جس قدر اچھی خوبیاں پائی جائیں گی اس کا رویہ اتنا ہی منظم ہوگا۔ راست بازی، صداقت، پرہیز گاری، سنجیدگی، و متانت اور حلم وغیرہ وہ خوبیاں ہیں جو کسی شخص کے رویّے کو بہتر بناتی ہیں۔ منظم رویّے کی مثال یہ ہے کہ جب ہمیں اختلاف رائے کا سامنا ہو تو ہم صبر و تحمّل سے کام لیں اور اس بات پر غور کریں کہ اختلاف رائے کا اصل سبب کیا ہے۔ اس طرح ہمیں دوسروں کی عزّت و آبرو کا خیال رکھنا چاہیے اور ہمیشہ یہ کوشش کرنی چاہیے کہ ہم پسندیدہ اخلاق کے معیار کو قائم رکھ سکیں اور اپنی عام زندگی میں بھی اس انداز سے اچھے اور پسندیدہ کام ہی کریں۔

مذہبی احکامات، علم الاخلاق کے اصول انسان کے رویّے پر بہت اچھا اثر ڈالتے ہیں۔ انسان کو دیانت اور راست بازی کی روشنی میں اپنا راستہ تلاش کرنا چاہیے۔ اور ثابت قدمی سے اس پر قائم رہنا چاہیے۔

منظم رویّے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اچھے اخلاق کے لیے ہمیشہ کوشاں رہیں کیوں کہ بد اخلاق آدمی کبھی بھی منظم رویے کا مالک نہیں ہو سکتا۔ جن لوگوں کا رویّہ نیک ہوتا ہے وہ باادب، متمدن اور پُر خلوص ہوتے ہیں اور وہ اپنے رہن سہن اور خانگی زندگی میں بھی حسن سلوک سے کام لیتے ہیں۔ نیک رویہ رکھنے والے شخص کا ذہن کھلا ہوتا ہے وہ کسی کے خلاف بغض و کینہ نہیں رکھتا۔ ایسے لوگ بہتر معاشرے کی تشکیل کرتے ہیں۔

منظم رویّے کا اظہار ہمارے ہر فعل اور کردار میں نمایاں ہوتا ہے۔ چلنا، پھرنا، نشست و برخاست، سفر کرنا، لباس، مکان، خوشی یا رنج کا اظہار غرض ہمارے رویّے میں شائستگی کی ضرورت ہے۔ تاکہ ہم مہذّب ہو سکیں۔ منظم رویّے کا مالک اپنی گفتگو میں بھی توازن رکھتا ہے۔ وہ کوئی بھی ایسی بات نہیں کرتا جس سے کسی کی دل شکنی ہو یا غلط اثر پڑے۔ وہ سچائی کا دامن کبھی نہیں چھوڑتا۔

مشق

۱۔ متوازن رویّے کی کیا کیا خوبیاں ہیں؟

۲۔ جو لوگ متوازن رویّہ نہیں رکھتے معاشرے میں ان کی کیا حیثیت ہوتی ہے؟

۳۔ اختلاف رائے کے وقت انسان کو کیا کرنا چاہیے؟

۴۔ رویّے میں ہم آہنگی کیوں ضروری ہے؟

۵۔ صحیح جواب کا انتخاب کر کے خالی جگہ پُر کیجیے۔

جو شخص لوگوں سے جتنا زیادہ ـــــــ سے پیش آئے گا اتنا ہی وہ معاشرے میں بہتر کردار ادا کر سکے گا۔ (نرمی، سختی، حسنِ سلوک)۔

جس کے اخلاق جتنے اچھے ہوں گے وہ معاشرے کی تشکیل میں اتنا ہی ـــــــ ثابت ہوگا۔ (بہتر، نیک، اعلیٰ)۔

خدا نے انسانوں کو اس جہاں میں ـــــــ بنایا ہے۔

(نیک، اعلیٰ، اشرف المخلوقات)

حُبُّ الوَطنی

اپنے وطن سے محبت کرنا حب الوطنی کہلاتا ہے۔ جو شخص اپنے وطن کی سرزمین اوراس میں پائی جانے والی اشیاء کی حقیقی قدروقیمت جاننے والا ہو اور ہموطنوں سے محبت کرنے والا ہو اسے مُحِبّ وطن کہتے ہیں۔ وطن سے محبت کرنے والا شخص تمام ہموطنوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اور اپنے تمام افعال و اعمال میں اپنے ہموطنوں کی فلاح و بہبود اور ملکی مفاد کو پیش نظر رکھتا ہے۔ حب الوطنی کا جذبہ ہر انسان میں فطری طور پر موجود ہوتا ہے۔ خواہ وہ کسی بھی قوم، قبیلے یا مذہبی فرقے سے تعلق رکھتا ہو۔ رنگ و نسل، علاقائی رسم و رواج اور لسانی اختلافات کی پروا کیے بغیر ہر مُحِبّ وطن شخص اس جذبے کو پروان چڑھا سکتا ہے اور مادرِ وطن کی حفاظت، اس کی تعمیر و ترقّی اور ہموطنوں کی خوشحالی میں وہ مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔

ایک شہری کس وقت مُحِبّ وطن کہلایا جا سکتا ہے اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ ایک مُحِبّ وطن شہری کے اوصاف واضح طور پر بیان کر دیے جائیں تاکہ اس کی حُبُّ الوطنی کی پہچان ہو سکے۔ یہ ایک عام تصوّر ہے کہ لوگ ملک کی حفاظت کرنے اور ملک کی خاطر لڑنے والوں ہی کو مُحِبّ وطن تصوّر کرتے ہیں۔ لیکن حُبُّ الوَطنی کے بارے میں یہ ایک محدود تصوّر ہے۔ اگرچہ اس خوبی کا شمار اعلیٰ درجے کی حُبُّ الوَطنی میں ہوتا ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ حُبُّ الوَطنی ایک ایسا وصف ہے جسے ہر شہری اپنا سکتا ہے۔ خواہ وہ معاشرے کے کسی طبقے سے تعلق رکھتا ہو۔ یعنی ہر وہ شہری جو وطن کی بقاء، سالمیت اور ترقّی پر یقین رکھتا ہو، ہموطنوں کو خوش و خرم اور خوشحال دیکھنے کا آرزومند ہو وہ مُحِبّ وطن کہلاتا ہے۔ اسراف سے اجتناب، عام

لوگوں سے بھلائی اور ہمدردی، ان کی جان و مال کی حفاظت، امن و امان کے قیام اور بحالی میں مدد دینا اور غریب اور محتاج ہموطنوں کی مدد کرنا بھی ایک محبِ وطن شہری کے اوصاف ہیں۔

ایک طالب علم اپنا تمام تر وقت علم کے حصول اور اس کے اضافے کی کوشش میں صرف کر کے اور ایک تاجر نفع کی کم سے کم شرح رکھ کر حب الوطنی کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔ سرکاری ملازم، مستعدی، دیانتداری، دلجمعی اور خلوص سے اپنا تمام تر وقت اپنے فرائض کی ادائیگی میں صرف کر کے مُحِبّ وطن بنتا ہے۔ مزدور کی حُبُّ الوطنی اس کی دیانتداری اور بھرپور مشقّت سے عیاں ہوتی ہے اور ایک مُحِبّ وطن آجر مزدور کی فلاح و بہبود کا ہمیشہ خیال رکھتا ہے تاکہ وہ دلجمعی سے کام کرے اور ملکی پیداوار میں زیادہ سے زیادہ اضافہ ہو سکے۔ اسی طرح ایک زمیندار بھرپور محنت اور مشقّت سے زرعی پیداوار میں خاطرخواہ اضافہ کر کے اپنے آپ کو وطن سے محبّت کرنے والے لوگوں کی صف میں شامل کر سکتا ہے۔ ہم وطنوں کے بارے میں اچھے خیالات رکھنے، ان کی فلاح و بہبود، اتّفاق و اتّحاد کے لیے کام کرنے والا ادیب بھی حُبّ الوطنی کی صفت سے متّصف ہوتا ہے۔ غرض معاشرے کا ہر شہری محبِ وطن بن کر ملک کی تعمیر و ترقی میں اپنا کردار ادا کر سکتا ہے۔

جذبۂ حُبّ الوطنی نہ صرف ایک شہری کے مفاد میں ہے بلکہ یہ ایک صحت مند معاشرے کی ضمانت بھی فراہم کرتا ہے۔ جب ایک مُحِبّ وطن شہری خود غرضی، اور تعصّب سے پاک ہوتا ہے تو اسے ہم وطنوں کی خدمت کر کے یک گونہ قلبی سکون اور مسرّت حاصل ہوتی ہے۔ اس طرح ایک پاکیزہ مُعاشرہ تشکیل پاتا ہے۔

یہ ایک جانی پہچانی حقیقت ہے کہ ہمارے ہاں اس چیز کی زیادہ قدر و قیمت ہوتی ہے جسے حاصل کرنے میں ہمیں مسلسل جدوجہد اور نسبتاً زیادہ محنت کرنا پڑتی ہے۔ انسان ایک لمحے کے لیے بھی ایسی چیز کی حفاظت سے غافل نہیں رہ سکتا۔ پاکستان ہمارا وطن ہے۔ جو ہمیں وراثت کے طور پر نہیں ملا اور نہ ہی صرف سبز ہلالی پرچم لہرا دینے سے یہ ۱۴ ر اگست ۱۹۴۷ء کو معرضِ وجود میں آیا ہے۔ بلکہ اسے طویل جدوجہد اور بے شمار قربانیوں کے بعد حاصل کیا گیا ہے۔

لہٰذا یہ حقائق ہم سے تقاضا کرتے ہیں کہ حُبُّ الوّطنی کے حقیقی جذبے کو بروئے کار لاتے ہوئے وطن کی بقا اور سالمیت کا تحفّظ کیا جائے۔ ملکی مفاد کو ہر چیز پر مقدم سمجھا جائے اور اس کی تعمیر و ترقّی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی جائے۔

مشق

۱۔ حُبُّ الوّطنی سے کیا مراد ہے؟
۲۔ مُحِبِّ وطن شہری کے کیا اوصاف ہیں؟
۳۔ حُبُّ الوّطنی کے تقاضے کیا ہیں؟
۴۔ حُبُّ الوّطنی پر ایک مضمون لکھیے۔

عالمی بھائی چارا

قومیت، وطنیت اور لسانیت کے تصوّر سے بلند ہو کر ایک دوسرے کے جذبات کو سمجھنا اور ان کا احترام کرنا محبّت اور ہمدردی کا رویّہ اختیار کرنا عالمی بھائی چارے کی بنیاد ہے۔ قوم اور وطن کی محبت ایک اچھی صفت ہے۔ کیوں کہ اس سے آدمی اپنی قوم اور ملک کی خدمت اور حفاظت کے لیے تیار رہتا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ آدمی دوسری قوموں اور ملکوں کے افراد کے متعلّق بغض اور تعصّب رکھے۔ دنیا کے تمام ملکوں اور تمام قوموں کے افراد دراصل حضرت آدمؑ کی اولاد کی وجہ سے بھائی بھائی ہیں۔ بھائی بھائی میں اختلاف بھی ہو سکتا ہے لیکن کسی خاص ملک یا خاص قوم کے ساتھ تعلّق کی وجہ سے اگر کوئی شخص اپنے کسی بھائی کے متعلق بغض اور کینہ اپنے دل میں رکھے تو اس قسم کی قوم پرستی اور وطن پرستی عالمی اخوّت کا قلع قمع کر دیتی ہے انسان نفرتوں، حقارتوں، دشمنیوں اور جنگ و جدل کا شکار ہو جاتا ہے۔ ٹوئن بی کا خیال ہے کہ بنی نوعِ انسان کو ایک کنبہ بن جانا چاہیے یا اپنے آپ کو ختم کر دینا چاہیے۔ عالمی اقوام کے انسانی شعور کی نشو و نما ہی اصل زندگی ہے۔ قوم پرستی دنیا کو تباہی کی طرف لے جا سکتی ہے جبکہ بھائی چارہ اور اخوّت تمام انسانوں میں بلا امتیاز نسل و مذہب مُساوی حیثیت کا گہرا احساس پیش کرتی ہے۔ لڑائی، جھگڑے، حسد، تعصّب، نفرت، حقارت، تشدّد اور انتہا پسندی کے جذبات نسل انسانی کو تباہ کر دینے کے مترادف ہیں۔

عالمی بھائی چارے کا احساس ایک دوسرے سے محبّت کرنے کا احساس ہے۔ انسانیت کے اصولوں کی برتری کا احساس ہے۔ قوموں میں اعتدال قائم کرنے کا احساس ہے۔ بنی نوعِ انسان کے فروغ کا احساس ہے۔ نسلِ انسانی کے لیے ایک بہتر معاشرے کی ضرورت کا احساس ہے۔

آج دنیا کو جس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ عالمی بھائی چارہ ہے جس میں آپس میں کسی قسم کا کوئی امتیاز نہیں ہوتا۔ نسل اور رنگ کا فرق جغرافیائی ہے۔ موسموں کے اختلافات اور فاصلوں نے یہ فرق پیدا کیا ہے ورنہ تمام دنیا کے انسان ایک جیسے ہیں۔ اس لیے تمام انسانوں کی کوششیں، صلاحیتیں امن، اتفاق اور صلح کے لیے ہونی چاہیں۔ خدا نے انسان کو فہم و فراست اور ذہانت کی دولت عطا کی ہے۔ اس کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ زندگی کے ہر شعبہ میں نمایاں ترقی کرتا۔ دنیا کی مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لیے حوصلہ پیدا کرتا۔ لیکن ایسا نہیں ہو رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بنی نوعِ انسان کے مسائل بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ کبھی عالمی جنگ کے خطرے منڈلانے لگتے ہیں۔ کبھی غریب ملکوں میں بھوک اور افلاس پھیل جاتا ہے۔ کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی اِنتشار کی صورت نظر آتی ہے۔ یہ ساری باتیں محض اس وجہ سے ہیں کہ ہم عالمی بھائی چارے کے سبق کو بھول چکے ہیں۔

عالمی بھائی چارے کے احساس کو زندہ رکھنے کے لیے ضرورت ہے کہ ہر انسان غیر قوموں اور ملکوں کے افراد کے متعلّق اپنے دل میں خیر خواہی کا جذبہ رکھے اور جہاں موقع پائے اس جذبے کو عمل میں لائے۔ اس بات کو سمجھنے کی ضرورت ہے کہ انسان کو پیدا کرنے کا کوئی نہ کوئی مقصد ہے۔ جو طاقت اور ذہانت ہمیں خدا نے دی ہے اسے انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے استعمال کیا جائے۔ دکھوں الجھنوں اور پریشانیوں کو ختم کیا جائے۔ جو والدین ہیں وہ اپنے بچوں کے لیے مشفقانہ رویّہ اختیار کریں۔ استاد شاگردوں کو مثبت اور مفید علم پہنچائیں۔ انھیں محبّت، ایثار اور مل جل کر رہنے کی تعلیم دیں تاکہ وہ اپنے قول و فعل میں توازن برقرار رکھ سکیں۔ حاکمِ وقت اپنی رعایا کے مسائل و مشکلات کو حتیّ الامکان وسیع پیمانے پر حل کرنے کی مخلصانہ کوشش کرے۔ بالکل اسی طرح ہر قوم دوسری قوم کے ساتھ بغض، کینہ، تعصّب، حسد اور تنگ نظری سے کام لینے کی بجائے اخوّت، ہمدردی، رواداری اور وسیع النظری سے کام لے، نیز باہمی معاملات کا خواہ وہ کسی سطح پر ہوں لحاظ رکھا جائے۔ اگر ابتدائی مرحلے سے لے کر انتہائی سطح تک ان باتوں کا خیال رکھا گیا تو یقینی طور پر عالمی بھائی چارہ اور اخوّت پیدا ہو گی اور انسان

انسان کے لیے قابل احترام اور معتبر ہوگا جس کی جان و مال اور آبرو کا تحفظ بلا کسی امتیاز کے سب پر لازم ہوگا۔

مشق

۱۔ عالمی بھائی چارے کی کیا کیا خوبیاں ہیں ؟
۲۔ جو قومیں عالمی بھائی چارے کی اہمیت کو نہیں سمجھتیں ان کا کیا انجام ہوتا ہے؟
۳۔ عالمی بھائی چارے کے احساس کو زندہ رکھنے کے لیے ہمیں کیا کرنا چاہیے ؟
۴۔ عالمی بھائی چارے اور قوم پرستی میں کیا فرق ہے؟
۵۔ ذیل کے جملوں کو پڑھیے اور جواب میں صرف صحیح یا غلط لکھیے۔
(الف) قوم اور وطن کی محبت ایک اچھی صفت ہے۔
(ب) قوم پرستی دنیا کو تباہی کی طرف لے جا سکتی ہے۔
(ج) نسل اور رنگت کا فرق جغرافیائی نہیں ہے۔

بحث و تکرار

جب کتے آپس میں مل کر بیٹھتے ہیں تو پہلے تیوری چڑھا کر ایک دوسرے کو بری نگاہ سے آنکھیں بدل بدل کر دیکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ پھر تھوڑی تھوڑی گونجیلی آواز ان کے نتھنوں سے نکلنے لگتی ہے۔ پھر تھوڑا سا جبڑا کھلتا ہے اور دانت دکھائی دینے لگتے ہیں اور حلق سے آواز نکلنی شروع ہوتی ہے۔ پھر باچھیں چر کر کانوں سے جا لگتی ہیں اور ناک سمٹ کر ماتھے پر چڑھ جاتی ہے۔ ڈاڑھوں تک دانت باہر نکل آتے ہیں۔ منہ سے جھاگ نکل پڑتی ہے۔ غیف غیف کی آواز کے ساتھ ساتھ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور ایک دوسرے سے چمٹ جاتے ہیں۔ اس کا ہاتھ اس کے گلے میں اور اس کی ٹانگ اس کی کمر میں' اس کا کان اس کے منہ میں اور اس کا ٹینٹوا اس کے جبڑے میں۔ اس نے اس کو کاٹا اور اس نے اس کو پچھاڑ کر بھنبھوڑا' جو کمزور ہوا دم دبا کر بھاگ نکلا۔

نامہذّب آدمیوں کی مجلس میں بھی اسی طرح تکرار ہوتی ہے۔ پہلے صاحب سلامت کر کے آپس میں مل بیٹھتے ہیں۔ پھر دھیمی دھیمی بات چیت شروع ہو جاتی ہے۔ ایک کوئی بات کہتا ہے' دوسرا بولتا ہے' "واہ' یوں نہیں ہے یوں ہے' واہ تم کیا جانو"۔ وہ بولتا ہے "تم کیا جانو" دونوں کی نگاہ بدل جاتی ہے' تیوری چڑھ جاتی ہے' رخ بدل جاتا ہے' آنکھیں ڈراؤنی ہو جاتی ہیں' باچھیں چر جاتی ہیں' دانت نکل پڑتے ہیں' تھوک اڑنے لگتا ہے' باچھوں تک کف بھر آتے ہیں' سانس جلدی جلدی چلتا ہے۔ رگیں تن جاتی ہیں' آنکھ' ناک' بھویں اور ہاتھ عجیب عجیب حرکتیں کرنے لگتے ہیں۔ غیف غیف کی آوازیں نکلنے لگتی ہیں۔ آستینیں چڑھائے ہاتھ پھیلائے اس کی گردن اس کے ہاتھ میں اور اس کی داڑھی اس کی مٹھی میں۔ لپاڈگی ہونے لگتی ہے۔ کسی نے بیچ بچاؤ کر کے چھڑا دیا تو غرّاتے ہوئے ایک اِدھر چلا گیا اور ایک اُدھر۔ اگر کوئی بیچ بچاؤ کرنے والا نہ ہوا تو کمزور نے

پٹ کر کپڑے جھاڑتے، سر سہلاتے اپنی راہ لی۔

جس قدر تہذیب میں ترقّی ہوتی ہے اسی قدر اس تکرار میں کمی ہوتی ہے۔کہیں غُرفش ہو کر رہ جاتی ہے۔ کہیں تو تکرار تک نوبت آجاتی ہے۔ کہیں آنکھیں بدلنے اور ناک چڑھانے اور جلدی جلدی سانس چلنے ہی پر خیر گذر جاتی ہے۔ مگر ان سب میں کسی نہ کسی قدر کتّوں کی مجلس کا اثر پایا جاتا ہے۔ پس انسان کو لازم ہے کہ اپنے دوستوں سے کتوں کی طرح بحث و تکرار کرنے سے پرہیز کرے۔

انسان میں اختلاف رائے ضرور ہوتا ہے۔ اور اس کے پرکھنے کے لیے بحث و مُباحثہ ہی کسوٹی ہے اور اگر سچ پوچھو تو بے مباحثہ اور دل لگی کے آپس میں دوستوں کی مجلس بھی پھیکی ہے۔ مگر ہمیشہ مُباحثے اور تکرار میں تہذیب، شائستگی، محبّت اور دوستی کو ہاتھ سے نہ جانے دینا چاہیے۔

پس اے میرے عزیز ہم وطنو! جب تم کسی کے خلاف کوئی بات کہنا چاہو یا کسی بات کی تردید کا ارادہ کرو تو خوش اخلاقی اور تہذیب کو ہاتھ سے مت جانے دو۔ اگر ایک ہی مجلس میں دو بدو بات چیت کرتے ہو تو اور بھی زیادہ نرمی اختیار کرو۔ چہرہ، آواز، لہجہ، وضع اور لفظ اس طرح رکھو جس سے تہذیب اور شرافت ظاہر ہو، مگر بناوٹ بھی نہ پائی جائے۔ تردیدی گفتگو کے ساتھ ہمیشہ سادگی سے معذرت کے الفاظ استعمال کرو مثلاً یہ کہ "میری سمجھ میں نہیں آیا، یا شاید مجھے دھوکا ہوا، یا میں غلط سمجھا۔ گو بات تو عجیب ہے مگر آپ کے فرمانے سے باور کرتا ہوں"۔ جب دو تین دفعہ بات کا الٹ پھیر ہو اور کوئی اپنی رائے کو نہ بدلے تو زیادہ تکرار مت بڑھاؤ۔ یہ کہہ کر "میں اس بات کو پھر سوچوں گا یا اس پر پھر خیال کروں گا" جھگڑے کو ہنسی خوشی دوستی کی باتیں کر کے ختم کر دو۔ دوستی کی باتوں میں اپنے دوست کو یقین دلاؤ کہ اس دو تین دفعہ کی الٹ پھیر سے تمھارے دل پر کدورت نہیں آئی ہے اور نہ تمھارا مطلب باتوں کی الٹ پھیر سے اپنے دوست کو کچھ تکلیف دینے کا تھا کیوں کہ جھگڑا یا شبہ زیادہ دنوں تک رہنے سے دونوں کی محبّت میں کمی ہو جاتی ہے۔ اور پھر رفتہ رفتہ دوستی ٹوٹ جاتی ہے اور ایسی عزیز چیز (جیسے کہ دوستی) ہاتھ سے جاتی رہتی ہے۔

جب تم ایسی مجلس میں ہو، جہاں مختلف رائے کے آدمی بیٹھے ہوئے ہوں تو جہاں تک ممکن ہو جھگڑے اور تکرار اور مباحثے کو مت آنے دو، کیونکہ جب تقریر بڑھ جاتی ہے تو دونوں کو ناراض کر دیتی ہے جب دیکھو کہ تقریر لمبی ہوتی جاتی ہے اور تیزی اور زور سے تقریر ہونے لگی ہے تو جس قدر جلد ممکن ہو اس کو ختم کرو اور آپس میں ہنسی مذاق کی باتوں سے دل ٹھنڈا کر لو۔

میں چاہتا ہوں کہ میرے ہم وطن اس بات پر غور کریں کہ ان کی مجلسوں میں آپس کے مباحثے اور تکرار کا انجام کیا ہوتا ہے۔

(سر سید احمد خان)

مشق

۱۔ جب ایک دوسرے کی بات سمجھ میں نہ آئے اور اختلاف بڑھ جائے تو اس کو کس طرح حل کیا جانا چاہیے؟

۲۔ ایک دوسرے کی بات کو زیادہ بہتر انداز سے سمجھنے کے لیے مصنّف نے کیا تجاویز پیش کی ہیں؟

۳۔ خوش اخلاقی پر ایک مختصر مضمون لکھیے۔

۴۔ مجلس میں گفتگو کے کیا کیا آداب ہوتے ہیں؟

ایک ہی سب کی منزل ہے

سبز ہلالی پرچم جگ میں سورج بن کر چمکے گا
خاکِ وطن کا ذرّہ ذرّہ، سونا بن کر دمکے گا
سورج بن کر چمکے گا
سونا بن کر دمکے گا

ایک ہی کشتی کے ہیں مسافر، ایک ہی سب کا ساحل ہے
ایک ہی سب کی راہ گزر ہے، ایک ہی سب کی منزل ہے
ایک ہی سب کا ساحل ہے
ایک ہی سب کی منزل ہے

اپنے عمل کی ضَو سے اپنے گھر کو روشن رکھیں گے
جان کی قیمت پر بھی قائم پیار کے بندھن رکھیں گے
گھر کو روشن رکھیں گے
پیار کے بندھن رکھیں گے

ہم ہر دَور میں روئے وطن پر پھول سجانے والے ہیں
بستی بستی علم و عمل کے دیپ جلانے والے ہیں
پھول سجانے والے ہیں
دیپ جلانے والے ہیں

آؤ لگائیں جان کی بازی پھیر دیں رخ طوفانوں کا
شمعِ وطن روشن ہے، ہم بھی کام کریں پروانوں کا
پھیر دیں رخ طوفانوں کا
کام کریں پروانوں کا

جب تک ہے یہ جان سلامت گیت وطن کے گائیں گے
چاند ستاروں سے بھی اونچا ہم پرچم لہرائیں گے
گیت وطن کے گائیں گے
ہم پرچم لہرائیں گے

(شررؔ نعمانی)

مشق

۱۔ "ایک ہی سب کی منزل ہے" سے شاعر کی کیا مراد ہے؟
۲۔ اپنے پیارے وطن کی عزّت ہم کس طرح بڑھائیں گے؟
۳۔ اپنے استاد کی رہنمائی میں اسے کورس کے انداز میں پڑھیے۔
۴۔ ہم سب ایک ہیں کے موضوع پر دو پیراگراف لکھیے۔
۵۔ درج الفاظ اپنے جملوں میں استعمال کیجیے۔
پرچم ۔ ذرہ ذرہ ۔ کشتی ۔ ساحل ۔ منزل ۔ عمل ۔ بندھن ۔ رخ ۔ وطن ۔

رواداری

دیانتداری اور قوّتِ برداشت کے ساتھ رنگ و نسل اور مذہب کے امتیاز سے بالاتر ہوکر دوسروں کے خیالات سننا اور سب کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنا رواداری ہے۔ دوسروں کے ساتھ بلاکسی تفریق کے بہتر رویہ اختیار کرنے والا روادار کہلاتا ہے۔

دراصل رواداری عفو و درگذر سے ملتی جلتی ایک اخلاقی صفت ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ آپس کے تعلّقات میں خیر خواہی سے کام لیا جائے۔ اور دوسروں کی معمولی معمولی غلطیوں اور کمزوریوں کی گرفت نہ کی جائے۔ رواداری کے ذریعے ہی معاشرے میں اُخوّت اور بھائی چارے کے جذبات پروان چڑھتے ہیں۔

رواداری کی تاکید تمام مذاہب میں کی گئی ہے۔ اس کی نشو و نما کے لیے صبر و ضبط عفو و درگذر اور وسیع النظری کے اوصاف لازمی عناصر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ صفت اسی وقت پروان چڑھتی ہے جب افراد آپس میں ایک دوسرے کی عزّت کریں۔ کسی کو حقیر اور کمزور نہ سمجھیں، سخاوت اور فیّاضی سے کام لیں یہاں تک کہ دشمن کے ساتھ بھی بھلائی کا رویہ اختیار کریں۔

تاریخ میں رواداری کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ پیغمبرِ اسلام حضرت محمّد صلّی اللہ علیہ وسلّم کے پڑوس میں بعض اہلِ کتاب رہتے تھے۔ آپ ان کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آتے۔ ان کو تحفے بھیجتے اور ان کے تحفے قبول فرماتے تھے۔

مسلمانوں نے فتوحات حاصل کیں تو مذہبی رواداری کا یہ حال تھا کہ مسلمان اور عیسائی ساتھ ساتھ اپنی اپنی عبادت کیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ عیسائیوں کا ایک وفد آپؐ کے پاس آیا تو آپؐ نے اسے مسجد نبوی میں ٹھہرایا۔ انھیں ان کی عبادت کرنے کی اجازت دی، ان کی دینی گفتگو نہایت توجہ سے سنی اور بڑی نرمی احترام

اور حسنِ اخلاق سے ان کی باتوں کا جواب دیا اور ان کے ہدیہ کو قبول فرمایا جو انھوں نے آپ کو پیش کیا تھا۔

رواداری کا تقاضا ہے کہ ہر فرد قوم و قبیلہ اور رنگ و نسل کے امتیازات سے بلند ہو کر تمام انسانوں کو آدمؑ کی اولاد سمجھے۔ اس طرح اسے یہ یاد رکھنے میں دشواری نہیں ہو گی کہ جس طرح اس کے دوسروں پر حقوق ہیں اسی طرح دوسروں کے بھی اس پر حقوق ہیں جن کا لحاظ رکھا جانا ضروری ہے۔ اس کی عام مثالیں ہمیں روزمرہ زندگی میں علم و ادب کی جگہوں، گھروں اور محلّوں میں نیز مذہبی تہوار منانے میں نمایاں طور پر ملتی ہیں جن میں کہیں مذہبی تفریق یا عداوت نہیں۔ بلکہ سب لوگ اپنے اپنے مذہب کے مطابق عبادت کرتے، تہوار مناتے اور اپنے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

یاد رہے آج بھی ہم ایک دوسرے کے ساتھ رواداری کی بہترین مثالیں قائم کر سکتے ہیں۔ بشرطیکہ اس کی تربیت کا سلسلہ بچوں میں ابتدائی زندگی سے شروع کیا جائے نیز ہمدردی، محبت، انصاف، درگذر اور نرمی جیسی خوبیوں کو پروان چڑھایا جائے۔ اس کی عملی صورت یہ ہو سکتی ہے کہ اگر ہم صاحبِ ثروت ہیں تو بلا کسی تعصّب اور تفریق کے ضرورت مند کی ضرورت کو پورا کریں۔

رواداری کے سلسلے میں ایک بات یاد رکھنی چاہیے کہ آپس میں ایک دوسرے کے دین و مذہب کو تنقید کا نشانہ نہ بنایا جائے۔ اگر ہم کسی کے عقائد کو برا بھلا کہیں گے تو جواب میں وہ بھی یقیناً ہمارے عقائد پر نکتہ چینی کرے گا جس کی وجہ سے باہمی رنجش پیدا ہو جائے گی جو عداوت کی صورت بھی اختیار کر سکتی ہے۔

اس کے برعکس اگر رواداری کا رویہ اختیار کیا جائے تو معاشرہ میں موجود فرقوں اور طبقوں میں خیر سگالی کے جذبات پیدا ہوں گے۔ اس سے قومی اتحاد اور یک جہتی کو فروغ حاصل ہوگا۔

مشق

۱۔ رواداری کی کیا کیا خصوصیات ہیں؟
۲۔ رواداری کے متعلق ہر مذہب میں کیا تلقین ہے؟
۳۔ رواداری کا احساس ہر فرد کے لیے کیوں ضروری ہے؟
۴۔ رواداری کے سلسلے میں کن کن باتوں کی احتیاط لازمی ہے؟
۵۔ رواداری پر ایک مختصر مضمون لکھیے۔
۶۔ صحیح جواب کا انتخاب کر کے خالی جگہ پُر کیجیے۔

(الف) رواداری عفوو درگذر سے ملتی جلتی ایک ________ صفت ہے۔
(نمایاں، اچھی، اخلاقی)

(ب) رواداری کی تاکید تمام ________ میں کی گئی ہے۔
(معاشروں، مذاہب، اداروں)

(ج) دوسروں کے ساتھ بلا کسی تفریق کے بہتر رویّہ اختیار کرنے والا ________ کہلاتا ہے۔
(روادار، نیکوکار، خوش اخلاق)

دیانت داری

کوئی چیز کسی کے پاس رکھی جائے اسے اسی طرح واپس کردیا جائے جس طرح لی تھی، جو کام کسی کے سپرد کیا جائے اسے معاہدے کے مطابق کیا جائے۔ جس شخص میں یہ خوبی ہوتی ہے اسے امین یا دیانتدار کہتے ہیں۔ دونوں لفظ قریب قریب ہم معنی ہیں گویا دیانت داری سے مراد یہ ہے کہ آدمی دوسروں کے حقوق مکمل طور پر ادا کرے۔

ہر مہذب شہری کا فرض ہے کہ وہ ہر شعبۂ زندگی میں دیانت سے کام لے۔ جو فرض بھی اسے سونپا گیا ہے ایمان داری سے اسے پورا کرے۔ دیانتداری کا دائرہ وسیع ہے۔ناپ تول ہو، عدل و انصاف ہو، عہد کی پابندی ہو، راز کی حفاظت ہو، وعدے کو پورا کرنا ہو، لین دین ہو، تجارت ہو، نوکری ہو ہر جگہ دیانت داری کا احساس اور اس پر مکمل طور پر عمل انسان کی سیرت کا نہایت نمایاں پہلو ہوتا ہے۔ یہ لوگوں کی نیکی اور شرافت کی پہچان ہے۔ جو لوگ امانت میں خیانت اور بدعہدی کرتے ہیں وہ معاشرے میں نفاق پیدا کرتے ہیں۔ بے یقینی اور نفرت کے لیے حالات کو سازگار کرتے ہیں۔ ایسے لوگ پورے معاشرے کے مجرم ہوتے ہیں۔ طمع، لالچ، دنیاداری، دنیا سازی، بے جا خواہش، بے سوچے سمجھے تقلید، تحقیق کی طرف سے لاپرواہی، معاشی اور معاشرتی تعلقات پر اثر انداز ہوتی ہے۔

ہم اور آپ جب ملتے ہیں تو معاشرہ بنتا ہے۔ ہم جب اپنی ذمہ داریوں سے غفلت برتتے ہیں اور مفاد پرستی میں مبتلا ہو جاتے ہیں تو یہ معاشرہ خراب ہو جاتا ہے۔ جس وقت ہم ایک دوسرے کے حقوق ادا نہیں کرتے اور اپنے فرائض سے غافل ہو جاتے ہیں تو ہم دیانتداری سے دور چلے جاتے ہیں، ایک دوسرے کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، ایک دوسرے کو غاصب سمجھتے ہیں۔

اور اس طرح دلوں میں نفرت اور کدورت پیدا ہو جاتی ہے۔

ایک نہایت دیانت دار بزرگ کا واقعہ مشہور ہے۔ وہ ایک باغ کی نگرانی پر مقرر کیے گئے۔ ایک دن باغ کے مالک نے ان سے کہا جاؤ ایک میٹھا انار توڑ کر لاؤ۔ وہ گئے اور ایک انار توڑ لائے۔ مالک نے اسے چکھا تو کہا یہ تو کھٹا ہے۔ دوسرا میٹھا انار توڑ کر لاؤ۔ وہ پھر گئے اور ایک انار توڑ لائے۔ مالک نے اسے بھی چکھا اور کہا یہ بھی کھٹا ہے۔ میں نے میٹھا انار منگوایا تھا۔ انھوں نے کہا مجھے نہیں معلوم کہ میٹھا انار کون سا ہے اور کھٹا کون سا۔ مالک نے غصے سے کہا کہ اتنے عرصہ سے تم باغ کے نگراں ہو اور تمھیں باغ کے اناروں میں کھٹے اور میٹھے کا فرق بھی معلوم نہیں۔ اس بزرگ نے تحمّل سے جواب دیا کہ میں باغ کی نگرانی اور حفاظت پر مقرّر تھا مجھے اس کے پھل کھانے کا نہ حق تھا نہ میں نے ایسا کبھی کیا۔ لہٰذا مجھے اس کے پھلوں کے ذائقے کا کچھ علم نہیں۔ باغ کا مالک دیانت داری کی اعلیٰ مثال سے بڑا حیران ہوا۔

دیانت داری کا اصول یہ بھی ہے کہ جو فرائض کسی پر عائد ہوتے ہیں ان کو پوری طرح ادا کیا جائے۔ اگر کوئی شخص اپنے فرائض کو پورا نہیں کرتا تو وہ دیانتدار نہیں بلکہ خیانت کا مُرتکب ہوتا ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے والدین کی خدمت کریں، ان کا کہنا مانیں، ان کے حُقوق کو ادا کریں، اپنی تعلیم پر پوری پوری توجّہ دیں ہمیشہ سچ بولیں کسی کو ستائیں نہیں، جھوٹ سے نفرت کریں۔ دراصل یہ سب فرائض ہیں جو مُعاشرے کی طرف سے کسی نہ کسی صورت میں ہم پر عائد ہوتے ہیں ۔ مُعاشرہ اس وقت ہی صحّت مند ہو سکتا ہے جب اس کی بنیاد دیانت داری پر رکھی گئی ہو اور لوگ ہر معاملے میں اس کا احترام کریں۔ دوسری صورت میں ماحول کشیدہ اور لوگ ایک دوسرے سے خوف زدہ ہوں گے۔ کیوں کہ ان کے درمیان باہمی اعتماد اور بھروسے کی فضا قائم نہیں ہو سکے گی۔ جس کی وجہ سے وہ ایک دوسرے کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھیں گے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ مُعاشرے میں باہمی تعاون کی فضا ختم ہو جائے گی۔ جس سے آخر کار معاشرہ تباہ ہو جائے گا۔

ہم سب کا فرض ہے کہ ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہوں۔ ایک دوسرے کے جذبات اور احساسات کا احترام کریں۔ جس سے جو وعدہ کریں اسے

پورا کریں۔ جو معاہدہ کریں اس کی پابندی کریں۔ پورا تولیں۔ سچ بولیں۔ کسی کو دھوکا نہ دیں۔ بُری باتوں سے ہر ممکن طور پر بچنے کی کوشش کریں۔

مشق

۱۔ دیانت دار شخص کے کیا کیا فرائض ہیں؟
۲۔ خیانت سے کیا مراد ہے؟
۳۔ مُعاشرہ کس طرح بنتا اور بگڑتا ہے؟
۴۔ دیانت داری پر ایک مختصر مضمون لکھیے۔

محنت کی عظمت

اپنے ہاتھ سے کام کاج کرنا اور اس پر فخر کرنا محنت کی عظمت کہلاتا ہے۔ یعنی اپنے رتبے اور حیثیت کا لحاظ رکھے بغیر جب ایک شخص اپنے ہاتھوں سے کسی کام کے کرنے میں شرم محسوس نہیں کرتا تو گویا وہ محنت کی عظمت کو جاننے والا ہے۔ یہ ایک بہت بڑی خوبی کی بات ہے کیوں کہ اسے اپنانے سے ایک انسان جہاں کام کاج کے سلسلے میں کسی حد تک دوسروں کی مُحتاجی سے بچ جاتا ہے وہاں دوسروں کے سامنے ایک اچھا نمونہ پیش کر کے ایک صحّت مند معاشرے کی تشکیل میں میں مددگار ثابت ہونے کا اعزاز بھی پاتا ہے۔ ایسا کرنے سے جہاں اسے دلی اطمینان اور ذہنی سکون ملتا ہے وہاں اس میں عاجزی اور انکساری کا جذبہ بھی پیدا ہوتا ہے۔

انسان کی بے شمار ضروریات ہیں جنھیں پورا کرنے کے لیے اسے کچھ نہ کچھ ضرور کرنا پڑتا ہے۔ اس طرح مُعاشرتی زندگی میں ایک دوسرے کی ضروریات پوری کرنے کے لیے مختلف آدمیوں کو مختلف کام کرنے پڑتے ہیں۔ کیوں کہ تمام کام ایک ہی آدمی کے بس کی بات نہیں۔ اس طرح کسی نے لوہار، کسی نے بڑھئی، کسی نے موچی، کسی نے دھوبی اور کسی نے نائی کا کام اختیار کر لیا تھا تاکہ ایک دوسرے کی ضروریات پوری ہوتی رہیں۔ اگر موچی جوتے نہ بناتا تو جوتا کہاں سے آتا۔ علیٰ ہٰذا القیاس ہر کام انسانی ضرورت کے تحت ہی مَعرضِ وجود میں آیا۔ اس لیے ان کاموں کے گھٹیا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور لوہار، موچی، بڑھئی، نائی، دھوبی وغیرہ کسی صورت میں بھی کم تر انسان نہیں ہیں بلکہ ان کی اہمیت اس انسان سے زیادہ ہے جو نکمّا رہ کر معاشرے پر بوجھ بنتا ہے۔ لوہار، موچی اور بڑھئی وغیرہ بھی اس طرح کے کاری گر ہیں جس طرح پرزے جوڑ کر موٹر بنانے والا ایک کاریگر ہے۔

تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ شاہنشاہ اورنگ زیب اپنی روزی کمانے کے

لیے ٹوپیاں بنا کر بیچا کرتے تھے اور اس بات پر فخر محسوس کرتے تھے۔ ایسا کر کے انھوں نے اس خیال کو بالکل باطل قرار دیا کہ بڑے انسانوں کو چھوٹے کام نہیں کرنا چاہییں۔ بوقتِ ضرورت اگر ایک انسان اپنے جوتے خود پالش کر لیتا ہے، کپڑوں کو پیوند لگا لیتا ہے یا ایک بڑا زمیندار بوقت ضرورت اپنی کھیتیوں میں خود ہل چلا لیتا ہے تو اس میں شرم کی قطعاً کوئی بات نہیں۔

اگر محنت کی عظمت کا پوری طرح احساس کر لیا جائے تو معاشرے میں ایک انقلاب رو نما ہو سکتا ہے اس سے ملکی پیداوار میں خاطر خواہ اضافہ ہو سکتا ہے۔ دفتروں میں سرکاری کام سُرعت سے انجام پا سکتا ہے یا ایک افسر اگر چپراسی کا انتظار کیے بغیر فائل ایک جگہ سے دوسری جگہ رکھ دیتا ہے تو اس میں شرم یا حقارت کی کوئی بات نہیں۔ اس خوبی سے مُتصف انسان کی قدر و قیمت بڑھ جاتی ہے اور وہ معاشرے میں اپنا مقام پیدا کر لیتا ہے۔

ہمیں چاہیے کہ ہم بوقت ضرورت چھوٹے موٹے کام شوق سے خود کریں، ایسا کرنے پر فخر محسوس کریں اور کسی کام یا پیشہ کو حقیر نہ سمجھیں۔

مشق

۱۔ محنت کی عظمت سے کیا مراد ہے؟

۲۔ محنت کی عظمت کے کیا فوائد ہیں؟

۳۔ آپ اس معاشرتی خوبی کو کیسے اجاگر کریں گے؟

روشنی کے عَلَم

روشنی کے عَلَم روشنی کے نشاں
زندہ قوموں کے زندہ نشاں
اپنی پلکوں پہ نیندیں سجاتے نہیں
اپنے ماتھوں کی شمعیں بجھاتے نہیں
توڑ دیتے ہیں زنجیرِ خوابِ گراں
زندہ قوموں کے زندہ جواں
ان کی ہمت سے ڈرتے ہیں طوفان تک
پھیل جاتے ہیں شہروں سے میدان تک
جا کے دیتے ہیں صحرا بہ صحرا اذاں
زندہ قوموں کے زندہ جواں
جذبۂ بیکراں عام کرتے ہیں وہ
جلتے شعلوں پہ آرام کرتے ہیں وہ
گاڑ دیتے ہیں وہ عظمتوں کے نشاں
زندہ قوموں کے زندہ جواں
حوصلہ ان کا غم سے نہیں ٹوٹتا
ان کے شہروں میں سورج نہیں ڈوبتا
آگے بڑھتے ہیں وہ مثلِ سیلِ رواں
زندہ قوموں کے زندہ جواں

(ساقی جاوید)

مشق

۱۔ روشنی کے عَلَم سے شاعر کی کیا مراد ہے ؟
۲۔ زندہ قوموں کے زندہ جوانوں کی شاعر نے کیا کیا خوبیاں بیان کی ہیں ؟
۳۔ اس نظم سے ہمیں کیا سبق ملتا ہے ؟
۴۔ علم بڑی دولت ہے اس موضوع پر دو پیراگراف لکھیے۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیغمبرِ اسلام تھے۔ آپؐ آخری نبی تھے۔ آپؐ ۲۰ ر اپریل ۵۷۱ء کو پیر کے روز مکہ کے مشہور قبیلے قریش کے، خاندان بنو ہاشم میں پیدا ہوئے۔ والد پیدائش سے چند ماہ پہلے ہی وفات پا چکے تھے۔ چھ برس کے ہوئے تو والدہ کا سایا بھی سر سے اُٹھ گیا۔ آٹھ برس کے ہوئے تو دادا بھی فوت ہو گئے۔ اس کے بعد آپ کے چچا ابو طالب نے آپ کی پرورش اپنے ذمہ لے لی۔ بڑے ہو کر کام کاج میں چچا کی مدد کرنے لگے۔ اس دوران بھیڑ بکریاں بھی چرائیں۔ جوان ہوئے تو تجارت کرنے لگے اور اس میدان میں اپنی صداقت، دیانت، امانت اور خوش خلقی میں منفرد مقام پیدا کیا اور صادق اور امین کے القاب پائے۔ اس زمانے میں آپ کے اردگرد، فسق و فجور کا دَور دَورہ تھا۔ اس کے باوجود اپنی نیک فطرت کی بدولت آپ کا کردار ہر قسم کی اخلاقی برائیوں اور ہر قسم کی مذہبی گمراہیوں سے پاک تھا۔

آپ کی عمر چالیس برس کی ہوئی تو آپ کو نبوّت کے منصب پر فائز کیا گیا۔ اس کے بعد آپ نے اپنی زندگی کے تیئیس سال اس منصب کے فرائض ادا کرنے میں اس طرح صرف کیے کہ آخر کار آپ کی تعلیمات ایک عالمی انقلاب کا ذریعہ بن گئیں۔ اس انقلاب کی زد چونکہ اس زمانے کے باطل نظام پر پڑتی تھی اس لیے اس زمانے کے بڑے بڑے سرداروں اور مذہبی پیشواؤں نے آپ کی زبردست مخالفت کی اور آپ کے ماننے والوں کو شدید قسم کے جبر و تشدّد اور موت تک کی آزمائش میں مبتلا کیا اس کے باوجو آپ تو کیا آپ کے ماننے والوں کے پائے استقلال میں بھی کبھی لغزش نہ آئی۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو تبلیغِ حق کی وجہ سے مسلّح مخالفت کا بھی سامنا کرنا پڑا، اکثر اوقات مجاہدین کی کم تعداد اور اسلحہ کی معمولی تعداد کے ساتھ آپ

کو اپنے سے کئی گنا بڑے لشکر سے جنگیں لڑنی پڑیں۔ لیکن آپ کا کمال یہ ہے کہ آپ نے حالت جنگ میں بھی اعلیٰ اخلاقیات کا مظاہرہ کیا اور جنگی قیدیوں اور مفتوحین کے ساتھ ایسا برتاؤ کیا کہ آج اس کا ذکر بھی اعجوبہ معلوم ہوتا ہے۔ آپ کے دشمنوں نے آپ کو مدینے کی طرف ہجرت کرنے پر مجبور کیا اور پھر وہاں بھی چین سے نہ بیٹھنے دیا اور پے در پے حملوں سے آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو ختم کرنے کی کوشش کی۔ لیکن ہجرت کے آٹھویں سال جب آپ فاتح کی حیثیت سے مکّے میں داخل ہوئے تو منظر یہ تھا کہ آپ کے دیرینہ دشمن سرنگوں آپ کے سامنے کھڑے تھے۔ ان کے کرتوتوں کا خمیازہ یہی ہو سکتا تھا کہ ان سب کو تہہِ تیغ کر دیا جاتا۔ لیکن آپ کی شانِ کریمی دیکھیے آپ نے ان سے فرمایا "آج میں تم سے یہی کہوں گا جو یوسفؑ نے اپنے بھائیوں سے کہا تھا اور وہ یہ کہ آج تم پر کوئی الزام نہیں جاؤ تم سب آزاد ہو۔"

فتح مکّہ کے بعد حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم زیادہ عرصہ دنیا میں نہ رہے۔ صفر ۱۱ھ میں بیمار ہوئے اور بارہ ربیع الاوّل کو اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملے۔ بہر حال انھوں نے اس سے قبل وسیع خطے میں اپنی تعلیمات پر مبنی اخلاقی، معاشرتی، معاشی اور سیاسی نظام قائم کر دیا تھا۔

حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم کی تعلیمات، عقائد و اعمال، اخلاق اور نفس کی پاکیزگی کے لیے مکمّل اور قابلِ عمل ہیں۔ آپؐ کی سیرت کی خوبی یہ ہے کہ آپ نے جو کچھ فرمایا اس پر پہلے خود عمل کر کے دکھایا۔ آپؐ فرمایا کرتے کہ اللہ نے مجھے اس لیے نبی بنا کر بھیجا ہے کہ میں اعلیٰ اخلاق کو کمال تک پہنچا دوں۔ آپؐ کا عدل و انصاف اور صبر و تحمّل بے مثال تھا۔ آپؐ کی سخاوت اور دریا دلی کا یہ عالم تھا کہ جو کچھ ہوتا غریبوں، مسکینوں اور سوال کرنے والوں کو عنایت کر دیا کرتے تھے۔ آپؐ لوگوں کے ساتھ نہایت نرمی اور خوش اخلاقی سے پیش آتے تھے۔ آپؐ میں کسی قسم کا تکبّر یا غرور نہیں تھا۔

حضرت محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم کی پوری زندگی عمل سے عبارت ہے۔ انھوں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ کسی سے غلط وعدہ نہیں کیا۔ جو وعدہ کیا اسے پورا کیا۔ خدمت خلق اور حسن سلوک میں آپؐ کا کوئی ثانی نہیں۔ آپؐ نے اخلاق پر بہت زور دیا۔

رواداری، عفوو درگزر، نرمی۔ محبت، خلوص اور پاکیزگی آپ کی فطرت تھیں۔ بھوکوں کو کھانا کھلانا، ضرورت مندوں کی ضرورت پوری کرنا، ناداروں اور مجبوروں اور معذوروں کے کام خود کرنا، مصیبت زدوں اور دکھی انسانوں کے غم میں شرکت کرنا ان کی عادت تھی۔ یہ روحانی انقلاب تو تھا ہی لیکن معاشرتی انقلاب بھی تھا۔ یہ اس دور کی بات ہے جبکہ معاشرہ تباہی کے غار پر پہنچ چکا تھا۔ شراب، زنا، جھوٹ، چوری، لڑائی، جھگڑے، جوا، فتنے فساد اور دوسری تمام معاشرتی اور اخلاقی برائیاں اپنی انتہاء کو پہنچ گئی تھیں۔ عورتوں کی مُعاشرے میں کوئی عزت نہیں تھی۔ انھیں حقیر تصوّر کیا جاتا تھا۔ بات بات پر جھگڑے ہو جاتے تھے اور پھر یہ دشمنی برسوں چلتی تھی۔ امن و امان ناپید ہو چکا تھا۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا انقلاب اپنی نوعیت سے نہایت اہم تھا۔ اس کی روح میں تشدّد کا عنصر کہیں بھی نہیں ہے۔ عمل، محبّت، اخوّت اور خیرخواہی اس کی روح ہے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم خود بے حد رحم دل تھے۔ بنی نوعِ انسانوں کے ساتھ انھیں سچا پیار تھا۔ اپنے پیغام کو انھوں نے عمل کے ذریعے عام کیا۔ اپنی دعوت کی نوعیت کو مثالیں دے دے کر سمجھایا۔ لہو لہان ہونے کے باوجود کبھی کسی کو بد دعا نہیں دی۔ کبھی کسی پر ظلم برداشت نہیں کیا۔ حالانکہ مسلمانوں کی اس وقت جنگی کیمپ کی سی زندگی تھی۔ اس کے مقابلے میں یہودیوں اور منافقوں کی مسلسل سازشیں تھیں۔ آپ نے اقتدار اور طاقت حاصل کرنے کے بعد بھی کسی ایک فرد کو نظر بندی میں نہیں ڈالا۔ نہ ہنگامی عدالتیں بٹھائیں۔ نہ تازیانے برسائے نہ جرمانے کیے۔ نہ تاوان ڈالے۔ نہ اختلاف اور تنقید کا حق سلب کیا۔ نہ کسی کی زبان بندی کی۔ سارا دارو مدار اپنی دعوت کی صداقت اور اپنے کردار کی پاکیزگی پر رکھا۔ طاقت کا کبھی غلط استعمال نہیں کیا۔ کبھی انسانیت کی تحقیر نہیں ہونے دی۔ ناداروں اور کمزوروں کا سہارا بنے۔ عفوو درگذر سے کام لیا۔ صبر و تحمّل سے کام لے کر نئی مثالیں قائم کیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ صداقت اور شرافت کے آگے لوگوں نے سر جھکا دیے۔ محبت انسانی کی اتنی عظیم مثال پوری تاریخ میں نہیں ملتی۔ اس سے بڑا انقلاب اب تک وجود میں نہیں آیا۔ یہ انقلاب اخلاقی، تعلیمی، تہذیبی اور معاشرتی تھا

اس کی اساس بنی آدم کی خیر خواہی پر تھی۔

مشق

۱۔ حضور اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کب پیدا ہوئے؟
۲۔ حضور اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے اوصافِ حمیدہ بیان کریں۔
۳۔ آپؐ کی زندگی کے اثرات کیا تھے؟
۴۔ آپؐ کی اخلاقی تعلیمات پر ایک مختصر مضمون لکھیے۔

حضرت موسیٰ علیہ السّلام

حضرت موسیٰ علیہ السّلام اس زمانے میں پیدا ہوئے جبکہ رعمسیس ثانی فرعون مصر کے حکم پر بنی اسرائیل کے لڑکوں کو پیدا ہوتے ہی قتل کر دیا جاتا تھا۔ آپ کی ولادت پر آپ کی والدہ بہت پریشان تھیں۔ خدا نے انھیں الہام کیا کہ وہ بچے کو صندوق میں بند کر کے دریا میں بہادیں، وہ بچے کی حفاظت کرے گا اور اسے پھر ان سے ملادے گا۔ والدہ نے ایسا ہی کیا۔ صندوق تیرتا ہوا شاہی محل کے قریب کنارے آلگا جسے فرعون کی بیوی آسیہ نے اپنے محل میں منگوالیا۔ خدا کی قدرت حضرت موسیٰ کی پرورش فرعون کے محل میں ہوئی اور انھیں دودھ پلانے کے لیے انھی کی والدہ مقرر ہوئیں۔

حضرت موسیٰ فرعون کے منہ بولے بیٹے تھے اور آپ نے شاہی محل کے جابرانہ ماحول میں پرورش پائی تھی لیکن آپ کی فطرت نیکی کی طرف مائل تھی لہٰذا ہوش سنبھالتے ہی آپ اس ماحول سے بیزار ہو گئے۔ بنی اسرائیل کی بھلائی اور ہمدردی کے جذبات آپ میں شدّت اختیار کر گئے اور آپ اس کا اعلانیہ اظہار بھی کرنے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فرعونِ مصر آپ کا سخت مخالف ہو گیا اور اس نے آپ کی گرفتاری کا حکم جاری کر دیا۔ لیکن حضرت موسیٰؑ وہاں سے مَدیَن چلے گئے۔ وہاں آپ کی شادی حضرت شعیبؑ کی بیٹی صفورا سے ہوئی۔ آپ وہاں دس سال رہے۔ اس کے بعد اپنے گھر والوں کے ساتھ مصر کی جانب روانہ ہوئے۔ راستے میں کوہِ طور پر پڑاؤ کیا۔ آگ کی تلاش میں نکلے تو ایک طرف روشنی نظر آئی۔ آپ روشنی کی طرف بڑھے تو آواز سنائی دی۔ "اے موسیٰ میں اللہ، جہانوں کا پروردگار ہوں۔" اس طرح آپ نبوّت کے لیے چُن لیے گئے۔ اور آپ کو کئی معجزے عطا ہوئے۔

حضرت موسیٰؑ کی تعلیمات کا فرعونِ مصر اور دوسرے لوگوں پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ بہت کم لوگوں نے آپ کی باتوں پر عمل کیا۔ اکثریت آپ کے خلاف ہی رہی اور آپ کو طرح طرح سے اذیتیں پہنچانا شروع کر دیں۔ آخر حضرت موسیٰؑ کو

خدا کا حکم ملا کہ وہ بنی اسرائیل کو مصر سے نکال کر فلسطین لے جائیں۔ آپ نے حکم کی پابندی کی اور بنی اسرائیل کو بحیرۂ احمر کے راستے نکال کر لے گئے۔

صبح ہوئی تو فرعون کو ان کے جانے کی خبر ہوئی۔ اس نے اپنا لشکر ان کے پیچھے کر دیا۔ بنی اسرائیل یہ دیکھ کر گھبرا گئے۔ لیکن حضرت موسیٰؑ نے انھیں تسلّی دی۔ جب وہ اپنی قوم بنی اسرائیل کے ساتھ کنارے پر پہنچے تو پانی سے راستے بن گئے۔ وہ خشک راستے پر چلتے رہے۔ فرعون نے بھی اپنے لشکر کو اسی راستے پر چلنے کا حکم دیا لیکن جوں ہی فرعون اور اس کا لشکر دریا کے درمیان پہنچا تو پانی اپنی اصلی حالت پر آگیا اس طرح فرعون اور اس کا لشکر غرق ہوگیا۔

حضرت موسیٰؑ پر نازل ہونے والی کتاب کا نام توریت ہے۔ اس میں خدا اور اس کی وحدانیت کا تصوّر موجود ہے۔ غیراللہ کی پرستش سے منع کیا گیا ہے۔ حضرت موسیٰؑ کے دس نمایاں نکات ہیں جو احکامِ عشرہ کہلاتے ہیں ان میں لکھا ہے۔ تو اپنے ماں باپ کو عزت دے تاکہ خدا تیری عمر دراز کرے۔ تو خون مت کر۔ تو زنا مت کر۔ تو چوری مت کر۔ تو اپنے پڑوسی پر جھوٹی گواہی مت دے۔ تو اپنے پڑوسی کے گھر کا لالچ مت کر۔ اپنے پڑوسی کی کسی چیز کا بھی لالچ مت کر۔

ان تعلیمات میں اولاد کے حقوق پورے کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ طہارت اور پاکیزگی کا حکم دیا گیا ہے۔ شراب نوشی سے روکا گیا ہے۔ سُود سے منع کیا گیا ہے۔ اسی طرح قیدیوں اور غلاموں کے سلسلے میں بھی ہدایات ہیں۔

مصر کو انسانی تہذیب کے نشو و نما کا اولین گہوارہ تصوّر کیا جاتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ مطلق العنان شہنشاہیت کو ایک نئے اور مختلف انداز سے پیش کیا گیا۔ ان کے ہاں ہر قبیلہ صرف اپنے سردار کو مانتا تھا۔ ہر طرف ظلم و تشدّد کا دور دورہ تھا۔ فرعون اپنے زمانے کا سب سے بڑا فرمانروا ہوتا تھا۔ ہر شخص کو اس کا حکم ماننا فرض ہوتا تھا۔ لوگ اس نظامِ حکومت اور ہر وقت کے ظلم و ستم سے تنگ آچکے تھے۔ ایسے دور میں حضرت موسیٰؑ کی تعلیمات اور ان کے نتائج تاریخ میں بے حد اہمیّت کے حامل ہیں۔ یہ نتائج انقلابی تھے۔ اس سے لوگوں کے ذہنوں میں تبدیلی آئی۔ حالات نے ایک نیا رخ اختیار کیا۔ قانون اور آئین کے

نام سے ایک ایسی چیز دنیا کے سامنے آئی جس کا تصوّر پہلے سے موجود نہ تھا۔اسی لیے حضرت موسیٰؑ کو دنیا کا پہلا آئین یا قانون بنانے والا کہا جاتا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ احکامِ عشرہ پر بعد میں مُعاشرت و سیاست کے تمام قوانین کی بنیاد رکھی گئی۔ ان احکام میں پہلی بار زنا، چوری، قتل وغیرہ کو اخلاقی، روحانی اور معاشرتی لحاظ سے جرائم قرار دیا گیا اور ان کے انسداد کے لیے کڑی سے کڑی سزائیں مقرر کی گئیں۔

حضرت موسیٰؑ نے نظامِ شہنشاہیت کی شدید مخالفت کی اور اس کے اثرات کو ختم کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ انھوں نے بتایا کہ خدائے مطلق کے سوا کسی کے آگے سر مت جھکاؤ۔ کسی انسان کو خدا مت سمجھو۔ غرض حضرت موسیٰؑ کے اس اخلاقی نظام نے شاہی نظام کی اصلاح کی۔ انسانی مُساوات کو فروغ دیا۔ عدل و انصاف کی حکومت قائم کی۔

مشق

۱۔ حضرت موسیٰؑ کی پیدائش کے وقت مصر کا حکمران کون تھا؟

۲۔ حضرت موسیٰؑ کی پرورش کس طرح ہوئی؟

۳۔ حضرت موسیٰؑ پر نازل ہونے والی کتاب کا کیا نام ہے؟

۴۔ احکام عشرہ کون کون سے ہیں؟

۵۔ حضرت موسیٰؑ کی اخلاقی تعلیمات پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔

مہاتما گوتم بدھ

گوتم بدھ ۵۶۸ ق ۔م کپل وستو میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام شدھودھن اور والدہ کا نام مایا تھا۔ والدین نے بچّے کا نام سدھارتھ رکھا۔ خاندانی نام گوتم تھا۔ علم کی روشنی حاصل ہوئی تو بدھ کے نام سے مشہور ہوئے۔

شہزادوں کی طرح پرورش پائی مگر طبیعت بے حد حسّاس تھی۔ ہر وقت سوچتے رہتے تھے۔ آرام و آسائش کی طرف بالکل مائل نہ تھے۔ باپ نے جب یہ حالت دیکھی تو شادی کرانے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ سولہ برس کی عمر میں یسودھا نامی ایک لڑکی سے شادی ہو گئی جس سے ایک لڑکا راہل پیدا ہوا۔

گوتم بدھ کو دنیاداری سے کوئی دلچسپی پیدا نہ ہو سکی۔ وہ حسبِ معمول غور و فکر میں غرق رہتے۔ ایک دن اسی حالت میں اپنے خادم کے ساتھ جا رہے تھے کہ ایک لاغر بوڑھا نظر آیا جو کمزوری اور بڑھاپے کی وجہ سے مشکل سے چل رہا تھا۔ ابھی وہ اس بات پر ہی غور کر رہے تھے کہ ایک بیمار آدمی کراہتا ہوا نظر آیا۔ اسے دیکھ کر وہ انسان کی بے بسی اور مجبوری کے بارے میں سوچنے لگے۔ کچھ دور ہی چلے ہوں گے کہ ایک جنازہ نظر آیا جسے لوگ کاندھے پر اٹھائے لا رہے تھے۔ وہ شدّتِ غم سے رو رہے تھے۔ ان مناظر نے گوتم بدھ کی زندگی میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ حقیقی اطمینان حاصل کرنے کا انھیں ایک ہی طریقہ نظر آیا کہ وہ اس دنیا کی زندگی کو خیرباد کہہ کر جنگل میں نکل جائیں۔ تو ایک رات وہ شاہی زندگی کو خیرباد کہہ کے اپنے بیوی بچوں کو چھوڑ کر نکل کھڑے ہوئے۔ چھ سال تک سخت ریاضتیں کرنے اور بھوکا پیاسا رہنے کی وجہ سے سوکھ کر کانٹا ہو گئے لیکن قلبی سکون حاصل نہ ہو سکا۔ پھر بھی انھوں نے ہمت نہیں ہاری۔ عبادت اور ریاضت کا سلسلہ جاری رکھا۔

آخر ایک دن گیا نامی ایک شہر کے باہر وہ ایک بَرگد کے درخت کے نیچے بیٹھے

تھے کہ ان کا دل روشن ہو گیا اور ان پر موت و زندگی، راحت و خوشی، نفع اور نقصان کے سارے راز کھل گئے اور انھیں نروان حاصل ہو گیا۔ یعنی انھیں معرفت الٰہی کا پتا مل گیا۔ نروان حاصل ہونے کے بعد گوتم بدھ نے اپنی تعلیمات کا آغاز کیا جسے بے شمار لوگوں نے قبول بھی کر لیا۔ رفتہ رفتہ باپ تک ان کی شہرت پہنچی تو انھوں نے کپل وستو اپنے پاس بلا لیا۔ گوتم بدھ جب کپل وستو پہنچے تو باپ ان کی یہ حالت دیکھ کر سخت ناراض ہوئے اور ان کا استقبال نہیں کیا جس کی وجہ سے گوتم بدھ محل سے واپس چلے گئے۔ باپ کے دوبارہ بلانے پر وہ پھر محل میں آگئے۔ جہاں ان کی بیوی نے ان کی تعلیمات پر عمل کیا اس کے بعد ان کے بیٹے نے اور پھر کئی اور رشتے دار ان کے حلقے میں شامل ہو گئے۔ ان کی تعداد بڑھتی چلی گئی۔ گوتم بدھ کا وعظ و تبلیغ کا سلسلہ جاری رہا۔

دوسری دفعہ جب وہ وطن آئے تو ان کے والد وفات پا گئے جن کی آخری رسومات ادا کر کے وہ دوبارہ سیاحت کو نکل گئے اور کم و بیش پینتالیس سال مسلسل تبلیغ کرنے کے بعد ۴۸۸ ق.م اسّی سال کی عمر میں انتقال کیا۔

مہاتما گوتم بدھ نے کتابی شکل میں اپنی تعلیمات پیش نہیں کیں بلکہ زبانی روایات کی شکل میں اپنے ماننے والوں تک پہنچائیں۔ ان کی وفات کے بعد ان کے ماننے والوں نے ان کے خیالات اور تعلیمات کو کتابی صورت میں محفوظ کرنے کے لیے کام شروع کیا اس کام میں خاصا اختلاف پیدا ہو گیا اور مختلف الخیال لوگ اپنے اپنے طریقوں سے ان کی تعلیمات جمع و ترتیب کرتے رہے۔

مہاتما گوتم بدھ کی تعلیمات اخلاقی نصیحتوں کا مجموعہ ہیں جس میں نروان (نجات) پر بہت زور دیا گیا ہے۔ نروان کے معنی باہر نکالنا یا پھونک دینا ہے۔ یعنی انسان اپنی تمام خواہشات کو ختم کر دے جس طرح چراغ کو پھونک مار کر بجھا دیا جاتا ہے۔ ان کے نزدیک ہر برائی کی جڑ خواہشات ہیں جنھیں قابو میں کر کے انسان نجات حاصل کر سکتا ہے۔ انھوں نے اپنے ماننے والوں کو دو گروہوں میں تقسیم کر کے الگ الگ تعلیم دی ہے۔ پہلا گروہ درویشوں کا ہے۔ جن کے لیے جفاکشی اور ریاضت کے طریقے بتائے گئے انھیں علم حاصل کرنے، دین داروں کو تعلیم دینے اور نجات کے حصول کے لیے محنت

کرنے کی تلقین کی۔ دوسرا گروہ دنیا داروں اور عام پیروؤں کا ہے جن کے لیے نیکی کی زندگی اختیار کرنا، درویشوں سے علم سیکھنا، گھر کے کام کاج کرنا، زاہدوں کے کھانے پینے کا بندوبست کرنا ان کے فرائض میں شامل تھا۔

مہاتما گوتم بدھ کی تعلیمات میں چار اعلیٰ صداقتوں کا ذکر خصوصی طور پر ملتا ہے۔ (۱) زندگی دکھ ہے (۲) دکھ کا سبب خواہشات ہیں (۳) خواہشات سے خود کو بچایا جاسکتا ہے۔ (۴) خواہشات سے رکنے کے لیے درمیانہ راستہ اختیار کرنا چاہیے۔ وہ اس درمیانے راستے کو اختیار کرنے کے لیے آٹھ باتوں کی تاکید کرتے ہیں۔

۱۔ صحیح علم اور عقیدہ یعنی اپنے خیالات میں وہم اور وسوسوں کو نہ آنے دیا جائے۔
۲۔ صحیح ارادہ یعنی ایک عقلمند شخص کے لیے ضروری ہے کہ وہ خیالات اور عقائد کی سچائی کے ساتھ ساتھ صحیح مقصد اور ارادہ بھی مقرر کرے۔
۳۔ صحیح کلام یعنی گفتگو میں سچائی ہو اور بات نرمی سے کی جائے۔
۴۔ صحیح عمل یعنی امن کے ساتھ رہتے ہوئے دیانت کا خیال رکھا جائے۔
۵۔ صحیح سلوک یعنی کسی بھی جاندار کو کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچائی جائے۔
۶۔ صحیح جدوجہد یعنی خود پر یا اپنے نفس پر قابو پایا جائے۔
۷۔ صحیح یادداشت یعنی اپنے تجربات کو اپنی یاد میں محفوظ رکھا جائے۔
۸۔ صحیح غور وفکر یعنی زندگی کے بارے میں غور وفکر سے کام لیا جائے۔

گوتم بدھ لوگوں کو ہدایت کرتے ہیں کہ وہ عقل و دانائی کے لیے مطالعے میں اضافہ کریں اور ان تمام اصولوں کی پابندی کریں۔ ان کی تعلیمات میں بظاہر خدا کا کوئی ذکر نہیں اور نہ ہی ان کی تعلیمات میں دوسرے مذہبی عقائد، عبادات، معاشیات یا سیاسیات کے کسی پہلو پر نمایاں روشنی پڑتی ہے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مہاتما بدھ کی تعلیمات بنیادی طور پر نفس کشی اور اخلاقی تربیت کا ایک سیدھا سادا ضابطۂ اخلاق اور خانقاہی زندگی کا ایک نظام ہے۔

گوتم بدھ ایک شاہی خاندان کے فرد ہونے کے باوجود ان تمام تکلیفوں سے گزرے جن سے ایک عام دیندار آدمی کو براہِ راست واسطہ پڑتا ہے۔ ان حالات میں انھوں نے ہدایت کا کام کیا۔ انھوں نے لوگوں کو ذات پات کی تفریق سے روکا اور

ہندوستانی معاشرے میں پہلی بار عورت کی عزّت و احترام کی طرف خصوصی توجہ دلائی۔

جس زمانے میں زرتشت کی تعلیم کے تحت ایران میں تمدّنی و مذہبی انقلاب کے آثار نظر آرہے تھے ہندوستان میں گوتم بدھ کی بھی اسی قسم کی تحریک چل رہی تھی۔ گوتم بدھ کو زرتشت کی بہ نسبت زیادہ مُشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ ہندوستان ذات پات کے بندھن میں بری طرح جکڑا ہوا تھا۔ عام آدمی کی زندگی کا حال ابتر تھا۔ ہندوستان کی تمام غیر آریائی نسلوں کو شودر سمجھا جاتا تھا اور ان کے متعلق یہ بات عام تھی کہ وہ پہلے جنم میں گناہوں میں ملوّث رہے ہیں اس لیے انھیں ذلیل و خوار ہی سمجھنا چاہیے۔ جو شخص شودر کو مذہب اور عبادت کا درس دیتا ہے وہ شودر سمیت دوزخ کا ایندھن بنے گا۔ کسی شودر کو یہ حق نہیں کہ وہ پڑھنے لکھنے کا خیال بھی دل میں لائے۔ اگر کوئی شودر وید کو سُن لے تو اس کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈال دو۔ غرض معاشرتی اور سماجی طور پر پورے ہندوستان کی حالت ابتر تھی۔ ذات پات کے نام پر عوام کی حالت عہد فرعونی اور بنی اسرائیل سے بدرجہ بدتر تھی۔ گوتم بدھ کی تعلیم کا براہِ راست ٹکراؤ برہمنی راج سے تھا جس نے انسانوں کو چار طبقات میں تقسیم کر رکھا تھا۔ جبکہ گوتم بدھ کی تعلیم میں مذہبی رسوم کی ادائیگی کے لیے کسی پنڈت یا برہمن کی قطعی ضرورت نہیں تھی۔ گوتم بدھ کی تعلیم کا اثر یہ ہوا کہ تمام نچلے درجے کے لوگ جن میں شودر بھی شامل تھے ان کے گرد جمع ہو گئے۔ گوتم بدھ نے تمام امتیازات ختم کر دیے۔ ان کے نزدیک تمام انسان ایک جیسی حیثیت کے مالک تھے۔ وہ سب کو بھائی بھائی کے ایک ہی رشتے میں پرو دینا چاہتے تھے۔

گوتم بدھ کی مرکزی اخلاقی تعلیم یہ تھی کہ خواہش کو زیر کیا جائے۔ تمام لوگوں کے ساتھ رحم دلی اور مہربانی سے پیش آیا جائے۔

مشق

۱۔ گوتم بدھ کے بچپن کے حالات زندگی بیان کیجیے ؟

۲۔ گوتم بدھ کی تعلیمات میں کون کون سی صداقتوں کا ذکر خصوصی طور پر کیا جاتا ہے ؟

۳۔ درمیانی راستے کو اختیار کرنے کے لیے گوتم بدھ نے کون کون سی باتوں پر زور دیا ہے؟

۴۔ گوتم بدھ کے زمانے میں ہندوستان کی مُعاشرتی اور سماجی زندگی کس طرح کی تھی ؟

۵۔ صحیح جواب کا انتخاب کر کے خالی جگہ پُر کیجیے۔

(الف) گوتم بدھ ــــــــ کپل وستو میں پیدا ہوئے ۔(۳۶۸۔ق۔م ۔ ۲۶۸۔ق۔م ۔ ۵۶۸۔ق۔م)

(ب) گوتم بدھ کے والد کا نام ــــــــ تھا۔ (شدھودھن ، پرشوتم) ۔

(ج) گوتم بدھ کا انتقال ــــــــ برس کی عمر میں ہوا۔ (سو سال۔ اسّی سال۔ ستّر سال)۔

زرتشت

زرتشت ۶۱۰ ق م میں ایران کے صوبے آذر بائی جان میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام پورشاسپ اسپیتما اور والدہ کا نام دگدداواسان تھا وہ مجوسی قوم سے تعلق رکھتے تھے۔

زرتشت نے استاد حکیم بزاکرزا سے تعلیم حاصل کی جو اس وقت کے ایک عظیم استاد تھے۔ بہت کم عرصے میں انھوں نے مختلف علوم مذہب، زراعت، گلہ بانی اور جرّاحی میں کمال حاصل کر لیا۔ وہ شروع ہی سے لوگوں کی مدد اور ان کی خدمت کر کے خوشی محسوس کرتے تھے۔ لوگوں کو تکلیف اور مصیبت میں مبتلا دیکھ کر وہ سوچ میں پڑ جاتے تھے کہ مصیبتیں کہاں سے آتی ہیں اور ان کا مستقل سدِّباب کیا ہو سکتا ہے۔ وہ اپنے مذہب سے مطمئن نہیں تھے۔ بلکہ ہر وقت حق کی تلاش میں سرگرداں رہتے۔ بیس سال کی عمر میں ان ہی خیالات کے پیش نظر انھوں نے گھر بار چھوڑ دیا۔ ایک پہاڑ پر گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ تقریب قریب دس سال تک وہ غور و فکر اور ریاضت میں مصروف رہے۔ تقریباً تیس سال کی عمر میں وہ پہاڑ سے واپس آ رہے تھے کہ انھیں وہ مقصد حاصل ہو گیا جس کی خاطر انھوں نے گھر بار اور دنیا سے علیحدگی اختیار کر لی تھی۔ یعنی انھیں آسمانی ہدایت نصیب ہوگئی۔

زرتشت نے اپنی قوم میں وحدانیت کی تبلیغ شروع کی اور لوگوں کو سمجھایا کہ خدا ایک ہے۔ کسی دوسرے معبود کی پرستش نہ کی جائے۔ لیکن اکثریت اپنے آباؤ اجداد کا دین چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہوئی بلکہ انھوں نے زرتشت کی زبردست مخالفت کی۔ زرتشت نے ہمت نہیں ہاری۔ بڑے عزم و ہمّت کے ساتھ انھوں نے اپنے مشن کو جاری رکھا۔ وہ عام لوگوں سے مایوس ہو کر شاہِ بلخ کے پاس تبلیغ کے ارادے سے پہنچے۔ شاہ نے بڑے غور سے ان کی تعلیمات کو سنا اور آخر کار وہ ان کی باتوں کا قائل ہو گیا۔ بادشاہ کے ایمان لانے کی وجہ سے زرتشتی مذہب نے بڑی تیزی سے ترقی کی۔ دور دراز کے

ملکوں میں بھی اس کی تبلیغ ہوئی۔ لیکن جب زرتشت نے ایران کے بادشاہ کی مدد سے ان کی تعلیمات کو توران میں پھیلانے کی کوشش کی تو دونوں ملکوں کے تعلقات خراب ہو گئے اور آپس میں لڑائی چھڑ گئی۔ زرتشت کی موت بھی ایک تورانی کے ہاتھوں ہوئی جس نے ان کی پیٹھ میں خنجر بھونک دیا تھا اس وقت ان کی عمر ۷۷ سال تھی۔

زرتشت خدائے واحد جسے وہ اہورامزدا کا نام دیتے ہیں (اہورا= مالک اور مزدا= دانا) کی صفات بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ خالقِ کائنات ہے۔ ازلی اور ابدی ہے۔ برتر اور اعلیٰ ہے۔ پاکیزہ، رحیم، خود مختار، مالکِ کُل، ہر چیز کو جاننے والا، سب کچھ دیکھنے والا، بے مثل، بے نظیر، غیر فانی، مُنصف، عادل، حافظ، نگراں، ہمارے حواس سے بلند ہماری ذات سے قریب تر، مہربان اور بخشنے والا ہے۔ گویا وہ توحید الٰہی کا اس کی ذات اور صفات کے ساتھ قائل ہیں۔ اسی طرح آخرت کی زندگی، گناہ و ثواب اور جنّت و دوزخ کے بھی قائل ہیں۔ وہ خدا کی یکتائی کے ساتھ اس کی صفات کے بھی قائل ہیں۔ وہ فرشتوں جنت و دوزخ، پیغمبروں پر یقین رکھتے ہیں اور کائنات کی تخلیق کے سلسلے میں ان کا نظریہ ہے کہ اس کی تخلیق چھ دوروں میں ہوئی اور خدا نے ترتیب وار آسمان سے لے کر انسان تک کو پیدا کیا اور تمام انسان ایک جوڑے سے پیدا ہوئے ہیں۔

زرتشت ایک اور طاقت بھی تسلیم کرتے ہیں جسے وہ اینگرہ مینو یعنی شر قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک کائنات کی تخلیق کے دوران خیر (نیکی) کا مقابلہ شر (بدی) سے ہوا۔ خیر اور شر دونوں قوتیں انسان کے جسم اور روح دونوں پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ انسان کو چاہیے کہ وہ خیر کو اپنائے اور شر سے دور رہے۔

زرتشت نے ایک طرف توحید کی تعلیم دی اور دوسری طرف انسان کی معاشرتی زندگی کی تنظیم پر زور دیا ہے۔ انھوں نے رہبانیت سے گریز کرتے ہوئے شہری اور معاشرتی زندگی کو پسند کیا ہے۔ ان کی اخلاقی تعلیمات میں نیک اعمال کے لیے خیالات کی پاکیزگی پر زور دیا گیا ہے۔ سچ بولنے، مستحقین کی مالی امداد کرنے، ریاکاری اور دکھاوے کی زندگی سے دور رہنے کی تلقین کی ہے۔ محنت اور جفاکشی اختیار کرنے کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ ان کے یہاں طہارت و پاکیزگی پر یہاں تک زور دیا گیا کہ نیک اعمال کا صلہ دونوں جہانوں میں ملتا ہے۔ نیک اعمال کا آخری نتیجہ اہورامزدا،

(خدا) سے ملاقات ہے۔ یہ قیامت کا دن ہے۔ جہاں انسان اپنی تمام ترنیکیوں اور بدیوں کے ساتھ پیش ہوگا۔

زرتشت نے آگ کو خدائی نور کی بہترین مثال قرار دیا ہے۔ زرتشتی مذہب میں آگ کو عبادت گاہوں میں روشن رکھنے کی وجہ یہ بتائی ہے کہ آگ تاریکی اور بدبو کو زائل کر دیتی ہے۔ اور روشنی خوشبو، پاکیزگی اور نیکی کی فضا پیدا کرتی ہے اس لیے اسے کبھی بجھنے نہیں دیا جاتا۔ ان کی تعلیمات کتاب گاتھا اور اوستا میں محفوظ ہیں۔

زرتشت کے یہاں اخلاق کو خاص اہمیت حاصل ہے جس میں عملی اخلاق پر زور دیتے ہیں۔ وہ نظریاتی اور ماوراء مسائل کو نظر انداز کرتے ہیں۔ باہمی تعلقات کے سلسلے میں یہاں واضح ہدایات ملتی ہیں۔

وہ ترک الدنیا اور رہبانیت کے خلاف ہیں۔

ان کے نزدیک زندگی اس وقت خوش گوار رہتی ہے۔ جب تک انسان اپنی جسمانی اور ذہنی صلاحیتوں کو صحت مند رکھے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان میں اضافہ کرنے کی بھی کوشش کرے۔

نیکی کی تلقین کرنا بھی نیکی ہے۔

شادی کرنا انسان کے لیے ضروری ہے۔

صفائی اور پاکیزگی انسان کے دل و دماغ پر اپنا خصوصی اثر رکھتی ہے۔

جھوٹ بولنا بدترین گناہ ہے۔

خواہشات پر قابو رکھنا چاہیے تاکہ وہ اپنی حدود سے تجاوز نہ کر جائیں۔

انسان باہم اخوت، محبت اور اتحاد کو فروغ دیں۔

اگر لاعلمی اور جہالت کے باعث کوئی گناہ کا مرتکب ہو جائے تو اولین موقع پر اس کی تلافی کر دے۔

تہذیب و تمدن کے فروغ میں بھی زرتشت کا اہم حصہ ہے۔ تمدنی لحاظ سے دنیا زرتشت کے دور میں بہت پس ماندہ تھی۔ زیادہ تر لوگ خانہ بدوش تھے۔ ذریعہ معاش کے لیے دور دراز کا سفر اختیار کرنا پڑتا تھا۔ زرتشت نے زمین کی کاشت پر زور دیا پیداوار بڑھانے، آب پاشی کرنے کی تلقین نے لوگوں کے رہن سہن پر کافی اثر ڈالا اور اس طرح

معاشرتی زندگی میں تبدیلی آئی۔ زرتشت نے اس بات کو بھی اہمیت دی کہ لوگ اپنی علمی، عملی اور فنی معلومات میں اضافہ کرکے خود بھی بہتر زندگی گذاریں اور دوسروں کی بھی مدد کریں۔ باہمی تعاون کی تلقین سے بھی معاشرے میں نمایاں تبدیلی آئی۔ سماجی اور معاشرتی اقدار کے فروغ نے لوگوں کے ذہنوں کو متاثر کیا۔ اس طرح خیر کو فروغ ملا۔

مشق

۱۔ زرتشت نے اپنی ابتدائی تعلیم کس طرح حاصل کی؟
۲۔ زرتشت کی تعلیمات کی بنیادی خصوصیات کیا کیا ہیں؟
۳۔ تہذیب وتمدّن کے فروغ میں زرتشت کا کیا حصّہ ہے؟
۴۔ زرتشت مذہب میں اخلاقیات کی کیا اہمیت ہے؟

شری کرشن جی

شری کرشن متھرا میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام واسدیو اور والدہ کا نام دیوکی تھا۔ ذات کے کھتری تھے۔ ان کی پیدائش کے وقت ایک ظالم اور جابر راجا کی حکومت تھی۔ نجومیوں کے کہنے پر اس نے دیوکی کے تمام بچوں کو قتل کر دینے کا حکم دے رکھا تھا۔ کرشن کو بچانے کے لیے ان کے والد نے انھیں چرواہے کی ایک لڑکی سے بدل لیا۔ اس طرح شری کرشن نے چرواہوں میں پرورش پائی اور وہیں کی ایک لڑکی رادھا سے شادی ہو گئی۔

شری کرشن نے اپنی بہادری اور انسان دوستی کی وجہ سے لوگوں کے دلوں میں گھر کر لیا اور وقت کے ساتھ ساتھ نہ صرف اپنی تعلیمات اور مقدس نظریات کی وجہ سے مشہور ہوئے بلکہ نجومیوں کی پیش گوئیوں کے مطابق اس راجا کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا جس کے حکم سے ان کے والدین کو قید کیا گیا تھا اور ان کے سات بھائیوں کو قتل کر دیا چکا تھا۔ لوگوں نے بہت چاہا کہ شری کرشن بادشاہ بن جائیں لیکن انھوں نے اسے قبول نہیں کیا بلکہ اصولِ فلسفہ و حکمت کی تعلیم اور جنگی فنون کے حصول میں مصروف ہو گئے۔

شری کرشن وشنو جو ویدوں کا سورج دیوتا ہونے کے علاوہ ہندو دھرم میں خدائے اعلیٰ کے آٹھویں اوتار ہیں۔ ایک عظیم فلسفی، بہادر سپاہی اور معجزانہ قوتوں کے مالک تھے۔ ان کی تعلیمات بھگوت گیتا میں موجود ہیں۔ بھگوت گیتا کے معنی نغمۂ مقدس یا بھگوان کے گیت کے ہیں۔ یہ بارہ جلدوں میں ہے جس میں دسویں جلد شری کرشن کے کارناموں، فلسفوں، مذہبی اور اخلاقی اصولوں پر مشتمل ہے۔ اُسلوبِ بیان اور زبان مؤثر اور مقبولِ عام ہے۔

بھگوت گیتا میں شری کرشن اور ارجن کے مکالمے خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں جو اس وقت پیش آئے جب ریاست کے دو رشتے دار خاندانوں کوروؤں اور پانڈوؤں کی دشمنی انھیں آمنے سامنے لے آئی اور باقاعدہ لڑائی کی صورت پیش آئی۔ ارجن جو

پانڈو تھا مظلوم ہونے کی وجہ سے شری کرشن کی مدد چاہتا تھا۔ لیکن اپنے مدِ مقابل اپنے ہی رشتہ داروں کو دیکھ کر لڑنے سے گریز بھی کر رہا تھا۔ شری کرشن نے دلائل کی روشنی میں اسے حق پر ثابت کیا اور ایک طویل بحث کے بعد اسے جنگ کرنے پر آمادہ کیا۔

شری کرشن کی تعلیم جو بھگوت گیتا میں ہے اپنی نوعیت سے نئی نہیں ہے۔ لیکن اس کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنی تعلیم میں ہندو ذہن کو اس کے تمام اختلافات کے ساتھ ایک خاص ترکیب سے پیش کرتے ہیں جو اس دور کے رُجحانات اور میلانات کو واضح کر دیتی ہے۔ نجات پانے کا فلسفہ بیان کرتے ہوئے وہ بتاتے ہیں کہ تکلیفوں کا سرچشمہ مایا ہے۔ اس سے بچا جا سکتا ہے۔ ان کی تعلیمات بے عملی، سستی اور کاہلی کے خلاف مُسلسل جدوجہد ہے۔ عمل، متعدی اور سرگرمی کو وہ زندگی کے لیے ضروری قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک فرد کی تخلیق اسی لیے ہوئی ہے کہ وہ اپنے عمل سے اپنے لیے نجات کا راستہ تلاش کرے۔ وہ نفس کُشی، دنیا دشمنی اور تارک الدنیا ہونے کی حوصلہ شکنی کرتے ہیں۔ ان کی اس تعلیم سے اس دور میں ہندو قوم اپنے روایتی جمود سے نکل کر با عمل ہو گئی۔ اس نے شری کرشن کو قوم کا نجات دہندہ قرار دیا۔ وہ تعلیمات سے اپنی قوم کو آگاہ کرتے رہے۔ ان کے دکھ درد میں ان کے ساتھ رہے۔ ان پر کیے گئے ظلم و ستم اور بے انصافیوں کے خلاف آواز اٹھاتے رہے۔ وہ ایک دن جنگل میں ایک درخت کے نیچے سو رہے تھے کہ ایک شکاری کا نشانہ بن گئے اور وہیں ان کی موت واقع ہو گئی۔

شری کرشن کا اصل مقصد اخلاقی تعلیم دینا اور نیکی کو عام کرنا تھا۔ انھوں نے بھگوت گیتا میں اخلاق کے بہترین اصول اور انسانی نفسیات کو اس کی گہرائی کے ساتھ پیش کیا۔ انھوں نے علم و عرفان کو حاصل کرنے کی بار بار تاکید کی۔ انھوں نے اس بات کا درس دیا کہ ہر حالت میں انسان جہالت سے نجات حاصل کرے۔ اس ضمن میں انھوں نے تین راستوں کا ذکر کیا ہے۔ یعنی عمل کا راستہ، عشق و عبادت اور خدمت کا راستہ۔ ان میں سے کوئی ایک راستہ بھی اختیار کر کے نجات حاصل کر سکتا ہے۔

شری کرشن خدا کی ذات کو ازلی اور ابدی قرار دیتے ہیں جس کا نہ کوئی آغاز ہے اور نہ کوئی انجام اور وہی تمام کائنات کا ربّ ہے۔ بھگوت گیتا میں لکھا ہے۔" میں

سب کے دلوں میں مکین ہوں۔ شکوک کا خاتمہ مجھ سے ہی ہے۔ تمام علموں کا انجام میں ہوں۔ یہ کائنات فانی ہے اور روح لافانی۔ ان دونوں سے جدا اور ماورا خدا ہے جو لافانی ہے۔ اس کا حکم کائنات میں جاری ہے جو ان کا رب ہے۔ روحانی تعلیم کے بارے میں ضبطِ نفس کی تین مختلف منزلوں کی تفصیل بیان کی ہے جن سے گزر کر ایک فرد روحانی درجہ پر پہنچ سکتا ہے۔ پہلی منزل میں صحیح عمل، دوسری منزل میں علم و مُشاہدہ اور ریاضت اور تیسری منزل میں وہ عبادت جو بندے کو خدا کے قریب کر دے۔

شری کرشن اعمال کو تین مختلف حصوں میں تقسیم کر کے اس کی الگ الگ اہمیت بیان کرتے ہیں۔ وہ محبت کو صرف خیالی چیز تصور نہیں کرتے بلکہ اسے انسانی فطرت کا ایک مُثبت اظہار کہتے ہیں جس میں معاشرتی فرائض اور عقلی مطالبات کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔

شری کرشن عشق حقیقی کے سلسلے میں ذات پات کو اہمیت نہیں دیتے۔ انسان کو ایک خدا کی پوجا کی تاکید کرتے ہیں۔ حقیقی محبت کا ان کے نزدیک یہ مفہوم ہے کہ نتیجہ سے بے پروا ہو کر اپنے فرائض کو نہایت سرگرمی اور دیانت سے ادا کیا جائے۔ خدا کسی قسم کی عبادت سے بے نیاز ہے۔

شری کرشن کی تعلیمات میں ایک طرف انسان دوستی کا ایک اعلیٰ اخلاقی تصوّر ملتا ہے تو دوسری طرف ان کی تعلیمات ذات پات کے تصور سے خالی نظر نہیں آتی۔ وہ ہر فرد کے لیے کسی نہ کسی ذات سے تعلّق ظاہر کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ وہ خود کو تمام دیوتاؤں، انسانوں اور کائنات کا خالق ظاہر کرتے ہیں۔

شری کرشن کی پیدائش سے پہلے ہندوستان کی عام حالت بہت ہی ابتر تھی۔ رعایا فسق و فجور میں مبتلا تھی۔ ہر طرف جہالت و گمراہی کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ ایسے دور میں شری کرشن نے ہندو قوم کی اصلاح کی۔ بھگوت گیتا کے ذریعے دینی، اخلاقی روحانی اور معاشرتی تعلیم دی اور لوگوں کو مصائب سے نجات حاصل کرنے کا راستہ دکھایا۔ انسان عالمِ مثال کی چھوٹی چھوٹی چیزوں کو حقیقی جانتا ہے اور ان ہی کی محبت

میں حیران سرگرداں پھرتا ہے اور اسی سے اسے تکلیف اور مصیبت کا صدمہ اٹھانا پڑتا ہے۔

مشق

۱۔ شری کرشن کہاں پیدا ہوئے؟
۲۔ ان کی جان ظالم راجا سے کس طرح بچی؟
۳۔ بھگوت گیتا میں کیا چیز بیان کی گئی ہے؟
۴۔ جس دور میں شری کرشن پیدا ہوئے ہندو قوم کی عام حالت کیا تھی؟
۵۔ ان کی عام تعلیمات کیا کیا ہیں؟
۶۔ شری کرشن نے اعمال کو تین مختلف حصوں میں کس طرح تقسیم کیا ہے؟
۷۔ ان کے نزدیک عشق حقیقی کے کیا معنی ہیں؟

گرونانک

گرونانک ۱۴۶۹ء میں لاہور کے قریب ضلع شیخو پورہ کے قصبہ تلونڈی (ننکانہ صاحب) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام مہتہ کالوچند کھتری تھا جو ہندو تھے۔ گھر کے معاشی حالات بہتر نہیں تھے اس کے باوجود ان کے والد نے انھیں تعلیم دلوانے کی کوشش کی۔ پہلے ہندی پڑھی اس کے بعد ملّا قطب الدین سے فارسی پڑھی۔ نو سال کے ہوئے تو وہ کئی زبانیں سیکھ چکے تھے۔ لیکن پڑھائی سے زیادہ ہر وقت غور و فکر میں غرق رہتے تھے۔ جوان ہوئے تو ایک ہندو گھرانے کی لڑکی سے شادی ہو گئی جس سے دو لڑکے اور ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ اسی زمانے میں ان کی بہن کی شادی نواب دولت خان لودھی کے دیوان جے رام سے ہو گئی۔ بہنوئی نے انھیں نواب کے یہاں نوکر کروا دیا۔

مُراقبہ اور سوچ بچار کی دلچسپی بڑھی تو اس ملازمت کو چھوڑ دیا اور تیس سال کی عمر میں گرُو بن گئے۔ بیوی بچوں کو چھوڑ کر ہندوستان کے مُقدّس مقامات کی زیارت کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ صوفیوں اور سادھوؤں کی صحبت میں رہنے لگے اور ان سے فیض اٹھایا۔ خصوصًا پنجاب کے مشہور صوفیاء اور بزرگوں کی صحبت نے روحانی مدارج میں اضافہ کیا۔

گرونانک ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں میں بے حد مقبول تھے۔ سب انھیں بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ گرونانک نے اپنے خاص اصول اسلام سے لیے ہیں۔ بہرحال انھوں نے کبھی اسلام کی مُخالفت نہیں کی اور ہمیشہ امن و آشتی کا درس دیا۔

گرونانک سکھ فرقے کے بانی تھے۔ انھوں نے ایک مسلمان عالم پیر سید میر حسن صاحب سے بہت کچھ سیکھا۔ یہاں ہی ان پر بہت سے علمی راز کھلے۔ مُراقبہ اور گیان کی دلچسپی کی وجہ سے انھوں نے بہت سے مقامات کی سیاحت بھی کی۔ اس دوران وہ

پنجاب بھی آتے رہے اور اپنی زندگی کے آخری دس پندرہ سال کرتار پور میں گزارے جو سکھوں کی آبادی کے لیے مشہور تھا۔ وہ یہاں اپنے خاندان کے ساتھ اپنے شاگردوں اور چیلوں کو اخلاقی تعلیم دیتے رہے۔

گرونانک کی تعلیمات "گرنتھ صاحب" میں ملتی ہیں۔ گرنتھ کے معنی کتاب کے ہیں اور صاحب سے مراد سردار ہے۔ یہ کتاب سکھوں کے مذہبی، ثقافتی اور سماجی قوانین کے ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس کی بے حد تعظیم کی جاتی ہے۔ اسے گردوارے میں رکھا جاتا ہے اس میں پرانے گروؤں کے بھجن، رامانند اور کبیر کی نظمیں بھی جمع کی گئی ہیں یہ دراصل دعاؤں اور نصیحتوں کا مجموعہ ہے جو نظم کی صورت میں ہے۔ گرونانک کا انتقال ۱۵۳۹ء میں ہوا۔

گرونانک نے اسلامی تعلیمات کے ساتھ ساتھ ہندو عقائد خصوصاً مایا اور نروان کی بھی تقلید کی۔ ان کی تعلیمات میں خدا کی وحدانیت اور قیامت کا اقرار ملتا ہے۔ ان کی نظر میں دنیا کی زندگی محض دکھاوا ہے اور اس کی کوئی ٹھوس حقیقت نہیں۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ خدا کا قُرب حاصل کرے۔ یہ جب ہی ممکن ہے کہ کوئی شخص سچے دل سے اس سے محبت کرے اور اس سے ڈرے۔ خدا ہی تخلیق کرتا اور وہی مارتا ہے وہ عظیم جلال والا ہے۔ اس تک سب کی پہنچ ہو سکتی ہے۔ لہٰذا ہمیں چاہیے کہ ہم محبت، پیار، سچی لگن اور جذبہ کے ساتھ اس تک پہنچیں۔ خدا کو مذہبی رسم و رواج کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ گرونانک نے اپنی تعلیمات میں اس بات پر بار بار زور دیا ہے کہ خدا صرف ایک ہے اس کا نام صدق ہے۔ وہ خالق ہے۔ انھوں نے نیّت اور ارادے کی اہمیت کو بھی نہایت واضح انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کے نزدیک انسان صرف زبانی سچائی کا اظہار کرنے سے جنّت میں نہیں جائے گا۔ وہ عمل کو ضروری سمجھتے ہیں۔ انھوں نے ذات پات کی تمیز، کمزور عقیدوں اور وہم پرستانہ رسوم کی شدید مخالفت کی ہے۔

گرونانک کے پیرو اپنا تشخص رکھتے ہیں۔ وہ بہت سی باتوں میں ہندو معاشرے سے علیحدہ اپنا طرزِ حیات رکھتے ہیں۔ ان کا لباس، زبان، رہن سہن میں ان کی اپنی اقدار اور روایات ہیں جس پر وہ سختی سے پابند ہیں۔ تہذیب کے فروغ میں ان کی خوش اخلاقی

اور اپنے مذہب پر سختی وہ مثبت صفات ہیں جن سے تاریخ برّصغیر میں وہ ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں۔

ان کے ہاں اخوّت اور مساوات ہے۔ اخلاق کی درستی اور بالیدگی کی طرف وہ زیادہ توجّہ دیتے ہیں۔ آج بھی سکھ کیس (سر کے بال)، کنگھا، جانگیا، کڑا، اور کرپان کو اپنی شناخت تصوّر کرتے ہیں۔

مشق

۱۔ گرونانک کہاں پیدا ہوئے تھے؟
۲۔ گرنتھ صاحب میں کس قسم کی تحریریں ہیں؟
۳۔ بت پرستی اور ذات پات کے بارے میں گرونانک کی تعلیمات کیا ہیں؟
۴۔ خدا کی وحدانیت کے بارے میں ان کی تعلیم کیا ہے؟
۵۔ ذیل کے جملوں کو غور سے پڑھیے۔ جواب میں صرف صحیح یا غلط لکھیے۔
(الف) گرونانک تلونڈی میں پیدا ہوئے۔
(ب) مراقبہ اور سوچ بچار کی دلچسپی بڑھی تو اس ملازمت کو چھوڑ دیا اور پچاس سال کی عمر میں گرو بن گئے۔
(ج) گرونانک ہندو اور مسلمانوں میں بے حد مقبول نہیں تھے۔
(د) گرونانک سکھ فرقے کے بانی تھے۔

مٹی کا دیا

جھٹ پٹے کے وقت گھر سے ایک مٹی کا دیا
ایک بڑھیا نے سرِ راہ لا کے روشن کر دیا
تا کہ راہ گیر اور پردیسی کہیں ٹھوکر نہ کھائیں
راہ سے آساں گزر جائے ہر اک چھوٹا بڑا
یہ دیا بہتر ہے اُن جھاڑوں سے اور فانوس سے
روشنی محلوں کے اندر ہی رہی جن کی سدا
گر نکل کر اک ذرا محلوں کے باہر دیکھیے
ہے اندھیرا گھپ در و دیوار پر چھایا ہوا
سُرخ رُو دنیا میں بس وہ رہنما مینار ہیں
روشنی سے جن کی ملاّحوں کے بیڑے پار ہیں

(خواجہ الطاف حسین حالی)

مشق

۱۔ اس نظم میں شاعر کیا سمجھانا چاہتا ہے؟
۲۔ سرِ راہ مٹی کا دیا روشن کرنے سے شاعر کی کیا مراد ہے؟
۳۔ اس نظم کا خلاصہ اپنے لفظوں میں لکھیے۔

حُقوق وفَرائض

حُقوق و فرائض کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ یہ ایک دوسرے کے ساتھ لازم و ملزوم ہوتے ہیں۔ ہر حق کے ساتھ ویسا ہی ایک فرض وابستہ ہوتا ہے۔ دراصل حُقوق و فرائض ایک ہی شئے کے دو رُخ ہیں۔ ایک کے بغیر دوسرے کا تصوّر نہیں کیا جا سکتا۔ مُعاشرے میں ہمارا حق دوسرے کا فرض بن جاتا ہے اور دوسرے کا حق ہمارا فرض بن جاتا ہے۔ اور دوسرے کا فرض اپنا حق ہوتا ہے۔

حُقوق "حق" کی جمع ہے۔ حُقوق سے مراد شہری کے وہ مطالبات ہیں جنھیں حکومت تسلیم کر لیتی ہے اور ان کو پورا کرنا ریاست کی ذمّہ داری ہوتی ہے۔ لاسکی (Laski) کے نزدیک حُقوق دراصل معاشرتی زندگی کی وہ شرائط ہیں جن کے بغیر کوئی فرد اپنی شخصیت کو پوری طرح پروان نہیں چڑھا سکتا۔

حقوق انسانی زندگی کی فلاح وبہبود کے لیے وجود میں آئے ہیں اور ان کے بغیر انسان کی فطری صلاحتیں بروئے کار نہیں آسکتیں۔

حقوق کی عام طور پر دو بڑی قسمیں ہیں:

۱۔ اخلاقی حقوق۔

۲۔ قانونی حقوق۔

اخلاقی حقوق سے مراد وہ حقوق ہیں جن کی بنیاد مُعاشرے میں رائج ایسی اخلاقی اقدار ہوتی ہیں جنھیں معاشرے میں تو تسلیم کیا جاتا ہے لیکن حکومت کا ان پر کوئی اثر ورسوخ نہیں ہوتا۔ جو لوگ ان اخلاقی قدروں کی پابندی کرتے ہیں مُعاشرے میں انھیں عزّت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ جو لوگ ان کی خلاف ورزی کرتے ہیں انھیں اچھا شہری نہیں سمجھا جاتا۔ ان حقوق کی ضمانت نہ تو حکومت دیتی ہے اور نہ ہی ان کی خلاف درزی پر ملکی قوانین کے تحت کوئی سزا دی جاسکتی ہے۔ مثلاً والدین اگر بوڑھے ہو جائیں تو ان کی خدمت اور دیکھ بھال اولاد کا فرض اور

والدین کا حق ہے۔ اگر اولاد اس فرض کو پورا نہ کرے تو حکومت کچھ نہیں کر سکتی۔ البتہ معاشرے کے لوگ نفرت اور ناراضگی کی نگاہ سے دیکھیں گے اور اسی دباؤ کی وجہ سے اخلاقی حقوق کی خلاف ورزی مشکل ہوتی ہے۔

قانونی حقوق سے مراد وہ حقوق ہیں جنھیں ریاست تسلیم کرتی ہے اور نافذ کرتی ہے۔ ان کی حفاظت اور ضمانت کے لیے قوانین بناتی ہے۔ ان حقوق کی خلاف ورزی کرنے والوں کے خلاف عدالتی چارہ جوئی کی جاسکتی ہے اور حکومت کو یہ حق ہے کہ وہ لوگوں سے ان کی زبردستی پابندی کرائے۔ کوئی فرد دوسروں کے قانونی حقوق کی خلاف ورزی نہیں کرسکتا۔ انھی حقوق کی بالادستی سے ریاست میں امن وسکون قائم رہتا ہے اور لوگ عزت واطمینان کی زندگی بسر کرسکتے ہیں۔

قانونی حقوق کی دو قسمیں ہیں۔

(الف) شہری حقوق۔

(ب) سیاسی حقوق۔

شہری حقوق کا تعلق لوگوں کی روزمرّہ زندگی سے ہوتا ہے۔ مہذّب معاشرتی زندگی کے لیے ان کا ہونا ضروری ہے۔ مثلاً حقِّ زندگی، حقِّ جائداد، حقِّ خاندان، حقِّ معاہدہ وغیرہ ہے۔

حقِّ زندگی ہر فرد کا بنیادی حق ہے۔ لہٰذا حکومت کا فرض ہے کہ وہ ہر شخص کی جان کی حفاظت کرے۔ ایک انسان کو اپنی زندگی ختم کرنے کا حق نہیں ہوتا۔ اسی طرح اسے یہ بھی حق نہیں پہنچتا کہ وہ کسی دوسرے کو اس کی زندگی سے محروم کردے گویا ہر فرد کو حق زندگی حاصل ہونے کے ساتھ ساتھ دوسروں کی زندگی کی حفاظت کرنا بھی فرض ہے۔

حقِّ جائداد سے مراد ہے کہ ہر فرد کو اس بات کا حق ہے کہ وہ اپنی مرضی سے جائداد خریدے یا بیچے اور اس سے پورا پورا فائدہ اٹھائے۔ حکومت کا فرض ہے کہ وہ شہریوں کی جائداد کی حفاظت کرے۔ البتہ اسے یہ حق حاصل ہے کہ وہ شہریوں کی جائداد پر ٹیکس عائد کرے اور کوئی قانونی بنیاد موجود ہو تو اسے ضبط بھی کرلے۔

حقِ خاندان میں شادی بیاہ، وراثت، بچوں کی پرورش وغیرہ کے حقوق شامل ہیں۔ معاشرتی زندگی میں خاندان کو بنیادی حیثیت حاصل ہے اور ریاست کا قانون خاندان کے اس حق کو تسلیم کرتا ہے۔

سیاسی حقوق سے مراد وہ حقوق ہیں جن کی بدولت اپنی ریاست کی سرگرمیوں میں حصہ لینا ہے۔ ان حقوق کی بدولت شہریوں کو انتخابات میں ووٹ ڈالنے، امیدوار کی حیثیت سے کھڑے ہونے اور حکومت کی کارکردگی پر مثبت نکتہ چینی کرنے کے مواقع ملتے ہیں۔ یہ حقوق جمہوری نظامِ حکومت کی کامیابی کے لیے ضروری ہیں۔

شہری حقوق اور سیاسی حقوق دونوں کو حکومت کی سرپرستی حاصل ہوتی ہے اور حکومت ان حقوق کی محافظ اور ضامن ہوتی ہے۔ شہری حقوق شہریوں اور غیر ملکیوں دونوں کو حاصل ہوتے ہیں۔ البتہ سیاسی حقوق صرف ریاست کے شہریوں کو ہی حاصل ہوتے ہیں، غیر ملکیوں کو نہیں۔

شہریوں کو جو حقوق دیے جاتے ہیں ان کے عوض ان پر کچھ پابندیاں اور ذمہ داریاں بھی عائد کی جاتی ہیں۔ یہی ذمّہ داریاں شہریوں کے فرائض کہلاتی ہیں۔ کوئی بھی فرد اس وقت تک اچھا شہری نہیں بن سکتا جب تک وہ اپنے فرائض بخوبی انجام نہیں دے سکتا۔

فرائض کی چار بڑی قسمیں ہیں۔

۱۔ اپنی ذات سے متعلق فرائض۔

۲۔ دوسروں سے متعلق فرائض۔

۳۔ ریاست سے متعلق فرائض۔

۴۔ بنی نوعِ انسان سے متعلق فرائض۔

۱۔ ہر شہری کا یہ فرض ہے کہ اپنے حقوق کو صحیح اور مثبت طور سے بروئے کار لائے تاکہ وہ اپنی صلاحیتوں اور قابلیتوں کو اجاگر کر سکے اور پوری ہمت اور جرأت سے اُن سے فائدہ اٹھائے۔

۲۔ ہر شہری کا فرض ہے کہ وہ دوسروں کے حقوق کا احترام کرے۔ معاشرہ

جب حقوق عطا کرتا ہے تو ساتھ ہی ساتھ یہ فرائض بھی عائد کرتا ہے کہ ان حقوق کو معاشرے کی فلاح و بہبود کے لیے استعمال کیا جائے۔

۳۔ قانون کی پابندی ہر شہری کا فرض ہے۔ قانون کے ذریعے معاشرے میں نظم و ضبط قائم کیا جاتا ہے۔ اگر قانون کی خلاف ورزی پر سزا نہ دی جائے تو قانون کا احترام ختم ہو جائے گا جس کی وجہ سے پورا معاشرہ انتشار اور افراتفری کا شکار ہو جائے گا۔ حکومت سے متعلق فرائض میں یہ بھی شامل ہے کہ ہر شہری ٹیکس کی ادائیگی پابندی سے کرے۔ ووٹ دینے کا حق جس طرح ہر شہری کو حاصل ہے اسی طرح ووٹ کا صحیح استعمال اس کا فرض ہے۔ ریاست سے وفاداری، اس کی سلامتی اور حفاظت ہر شہری کا فرض ہے اور ہر فرد کو ذاتی اغراض اور انفرادی مفادات سے بالاتر ہو کر ریاست کے مفاد کو اور قومی یک جہتی کو ترجیح دینا لازمی ہے۔

۴۔ بنی نوعِ انسان سے متعلق فرائض سے مراد ہے کہ رنگ، نسل، علاقے اور زبان سے بلند ہو کر انسان کا مفاد مدِّ نظر رکھا جائے۔

درحقیقت حقوق کی طرح فرائض کی بھی ایک فہرست موجود ہے۔ ان فرائض کی ادائیگی سے انسان اخلاقی نصب العین سے قریب تر ہو جاتا ہے۔ ان حقوق و فرائض میں ماں، باپ، اولاد، خاوند، بیوی، رشتے دار اور پڑوسی کے حقوق و فرائض شامل ہیں جیساکہ پہلے بھی بتایا گیا ہے کہ ایک فریق کے حقوق دوسرے فریق کے فرائض کہلاتے ہیں۔ حقوق اسی وقت حقوق تسلیم کیے جاسکتے ہیں جب کہ انھیں دوسرا فرض سمجھ کر ادا کرے۔

والدین کے حقوق میں ان کا احترام، محبّت، اطاعت اور خدمت کے ساتھ ساتھ ان کی وفات کی صورت میں ان کے رشتے داروں اور احباب کے ساتھ حسنِ سلوک وغیرہ شامل ہیں۔

اولاد کے حقوق میں ان کی بہتر پرورش، تعلیم و تربیت، نرمی اور محبت کا سلوک ایک سے زیادہ بچوں کی صورت میں سب کے ساتھ یکساں برتاؤ، تعلیم سے فراغت کے بعد ان کے ذریعۂ معاش کا انتظام، ان کی ازدواجی زندگی کا مناسب اہتمام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

خاوند کے حقوق میں یہ شامل ہے کہ اس کی عزت اور مال کی حفاظت کی جائے۔ اس کی اطاعت اور خدمت خوش دلی سے کی جائے۔ بچوں کی صحیح دیکھ بھال اور تربیت کی جائے اور رشتے داروں سے اخلاق سے پیش آیا جائے۔ ان سب حقوق کی ادئیگی بیوی پر فرض ہے۔

بیوی کے حقوق میں خاوند کا اس سے مہربانی اور محبت کا برتاؤ کرنا، حسنِ سلوک کا رویّہ اختیار کرنا، اس کے نان و نفقہ کا حسبِ حیثیت انتظام کرنا وغیرہ شامل ہیں۔

رشتے داروں کے حقوق و فرائض میں باہم نیکی اور خیر خواہی کا برتاؤ کرنا، ایک دوسرے کی مالی امداد میں پیش پیش رہنا، غریب اور یتیم رشتے دار بچوں کی اعانت اور دستگیری کرنا وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

پڑوسیوں کے حقوق میں ان کی خبر گیری اور حسنِ سلوک کا برتاؤ کرنے کے ساتھ ساتھ خوشی اور غم میں شریک ہونا، انھیں تحفے بھیجنا اور ان کی ضرورتوں کو اپنی حیثیت کے مطابق پورا کرنا وغیرہ شامل ہیں۔

ذرا غور کیجیے تو اندازہ لگانا مشکل نہیں ہوگا کہ فرائض کی ادائیگی ہی سے معاشرے کو اِستحکام حاصل ہوتا ہے۔

ان سب معاشرتی اداروں کے فرائض انفرادی بھی ہیں اور اجتماعی بھی۔ انفرادی یہ ہے کہ ہر ادارہ اپنے مخصوص دائرۂ اختیار میں فرائض ادا کرتا ہے۔ اس طرح ہر ادارہ دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ یعنی مدرسہ تعلیم و تربیت دیتا ہے۔ ریاست نگہداشت کی ضامن ہے۔ مسجد عبادت کی جگہ ہے، اسی طرح خاندانوں کے اور فرائض ہیں۔ علاوہ ازیں ان اداروں کے کچھ اجتماعی فرائض بھی مقرر ہیں۔

طلبہ و طالبات میں حقوق و فرائض کی ادائیگی کا احساس درجہ بدرجہ پیدا کیا جا سکتا ہے۔ پہلے خاندان کی سطح پر والدین اور گھر کے دوسرے افراد ان پر اثر انداز ہوتے ہیں، پھر محلہ ان کی کردار سازی کر کے انھیں حقوق و فرائض کی ایک مخصوص انداز سے تربیت دیتا ہے۔ اس کے بعد وہ مدرسے سے بھرپور طور سے تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت حاصل کرتے ہیں اور یوں ان سب اداروں کے ذریعے ان میں حقوق و فرائض کو سمجھنے اور انھیں ادا کرنے کا شعور پیدا کیا جا سکتا ہے۔

مشق

۱۔ حقوق و فرائض کا آپس میں کیا تعلق ہے؟

۲۔ اخلاقی حقوق سے کیا مراد ہے؟

۳۔ قانونی حقوق ہماری حفاظت کس طرح کرتے ہیں؟

۴۔ شہری حقوق اور سیاسی حقوق میں کیا فرق ہے؟

۵۔ فرائض کی کون کون سی قسمیں ہیں؟

۶۔ طلبہ اور طالبات میں حقوق و فرائض کی ادائیگی کا احساس کس طرح پیدا کیا جاسکتا ہے؟

سماجی ادارے

افراد سے مُعاشرہ بنتا ہے۔ افراد کی تربیت کے لیے مُعاشرتی ادارے فعّال کردار ادا کرتے ہیں۔ خصوصاً خاندان، پڑوس اور مدرسہ۔

دراصل مُعاشرتی ادارے افراد کی ضروریات کی تکمیل کا منظّم ذریعہ ہوتے ہیں جو رائج شدہ اُصول و قوانین کی حدود میں اپنے کام انجام دیتے ہیں۔ ہر ادارے کا ایک مخصوص کام ہوتا ہے جو بعض اوقات بڑھ کر وسیع بھی ہو جاتا ہے۔ قدیم زمانے سے یہ ادارے موجود ہیں جو معاشرے کی تعمیر اور ترقّی میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ ادارے کسی کوشش کا نتیجہ نہیں ہوتے بلکہ اس ضرورت اور تسکین کے لیے خود بخود بن جاتے ہیں جن حالات کے تحت فرد زندگی گذار رہا ہوتا ہے۔ مشہور ماہرِ عمرانیات ایچ ای بارنیس (H.E. BARNES) کے نزدیک "معاشرتی ادارے وہ سماجی ڈھانچہ اور کل پُرزے ہیں جن کے ذریعے انسانی مُعاشرہ مختلف انسانی ضروریات کی تسکین منظّم طریقے پر کرتا ہے۔"

جیساکہ اوپر بیان ہوا ہے کہ کردار سازی میں جو ادارے نمایاں حیثیت رکھتے ہیں وہ خاندان، پڑوس اور مدرسے ہیں ان کی تفصیل حسبِ ذیل ہے!

خاندان

خاندان معاشرے کا قدیم ترین اور بنیادی تربیتی ادارہ ہے جو کسی نہ کسی صورت انسانی معاشرے میں پایا جاتا ہے۔ خاندان کا لفظ محدود اور وسیع دونوں معنوں میں آتا ہے۔ محدود معنی میں خاندان سے مراد شوہر، بیوی اور بچے ہیں۔ جبکہ وسیع معنی میں شوہر بیوی اور بچوں کے علاوہ تمام لوگ بھی اس میں شامل ہوتے ہیں جن سے نسب (نسل) کا رشتہ ہوتا ہے۔ دراصل یہ ایک قسم کا گروہ یا تنظیم ہے جو شادی کے ذریعہ

وجود میں آتی ہے۔ اس کے تین مُحرّکات ہوتے ہیں۔یعنی معاشی ضرورت، اولاد کی خواہش اور محبت۔ خاندان اس ادارے کا نام ہے۔ جو شوہر بیوی اور بچوں پر مشتمل ہو۔ درحقیقت خانگی زندگی ایک چھوٹی دنیا کی طرح ہے جہاں میاں بیوی کے اچھے اور خوشگوار تعلقات نہ صرف اس کی اپنی زندگی کو جنّت کا نمونہ بنا دیتے ہیں بلکہ ان کے بچوں پر بھی مُثبت اور اچھے اثرات پڑتے ہیں۔ یہ ادارہ صرف نسل بڑھانے کا کام ہی نہیں کرتا بلکہ فرد کی ابتدائی دور میں سماجی تربیت بھی کرتا ہے۔ بچہ پیدائش کے ساتھ ہی اس سے وابستہ ہوجاتا ہے اور وہیں سے خیالات، طرزِ عمل، اخلاق اور مذہب کی تعلیم حاصل کرتا ہے اور اپنی ثقافت اور تمدّن کو جانتا ہے۔ خاندان ہی اس کی ذہنی ترقی، اخلاقی رہنمائی اور مذہبی تعلیم کا اوّلین ذریعہ ہوتا ہے۔

خاندان میں والدین کا کردار سب سے اہم ہے۔ وہی بچے کی پوری سیرت و کردار کی تشکیل کرتے ہیں۔ ان کا بچوں کو غلط کاموں سے روکنا اور اچھے کاموں پر شاباش دینا در اصل انھیں اچھائی اور برائی اور نیکی اور بدی میں فرق سمجھاتا ہے۔ جس کے باعث بچہ بڑا ہو کر مُعاشرے کا کار آمد شہری بنتا ہے۔ آج نئی نسل کی افراتفری اور انتشار کا سبب ان کی تعمیر و تربیت میں والدین کی کوتاہی بھی ہے۔ اس انتشار کے خواہ کوئی بھی عوامل ہوں آج اس کی شدید ضرورت ہے کہ والدین اپنی اولاد پر پوری توجہ دیں جو صرف روپے پیسے ہی کی محتاج نہیں بلکہ ان کے حقیقی پیار اور سلوک کی خواستگار ہے۔

اگر ہم اپنے بچوں میں حُبّ الوطنی اور قومی نظریہ کا شعور بیدار کرنا چاہتے ہیں تو ابتدائی تربیت میں ہی اس کا اہتمام کرنا ہوگا جو ماں باپ سے بہتر کوئی دوسرا نہیں کر سکتا۔ اس کے بعد ہی ہمیں حُبّ الوطن اور وطن دوست شہری مل سکتے ہیں جو باکردار، بااخلاق ہونے کے ساتھ ساتھ باہمی یک جہتی، حُسنِ سلوک اور باہمی تعاون کے عادی ہوں۔

پڑوس

پڑوس یا محلہ ایک اہم معاشرتی ادارہ ہے جو کردار سازی میں نمایاں کردار ادا کرتا ہے۔ ہمسایہ سے مراد وہ لوگ ہیں جو کسی فرد کے گھر کے آس پاس رہتے ہوں، ان کو پڑوسی بھی کہا جاتا ہے۔ پڑوسیوں میں رنگ و نسل یا عقیدہ وغیرہ کے

حوالے سے کوئی امتیاز نہیں کیا جاتا۔

بچہ جب اس عمر کو پہنچتا ہے کہ وہ خاندان کے افراد کے سوا دوسرے لوگوں کے ہاں جائے تو پڑوس وہ معاشرتی ادارہ ہے جہاں بچے اپنے ہم عمروں میں میں جاکر اٹھتا بیٹھتا ہے اور ان کے طور طریق سیکھتا ہے۔

پڑوس کے خوشگوار ماحول کے لیے ضروری ہے کہ ان کے حقوق کا خیال اسی طرح رکھیں جس طرح اپنے حقوق کا خیال چاہتے ہیں۔ دنیا کے ہر مذہب میں پڑوسی حسنِ سلوک اور خیر خواہی کے مستحق ٹھہرائے گئے ہیں۔

پڑوس کی تنظیم ایک معاشرتی ادارے کی حیثیت سے اسی طرح ضروری ہے جیسے گھر کی تنظیم۔ اس میں ایسے انتظامات کی ضرورت ہے جس کے ذریعے اجتماعی شعور اور گروہی تنظیم کی خصوصیات ابھر سکیں۔ اس کے ذریعے ہم ایک دوسرے سے واقف ہو کر ایک دوسرے کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور باہم مل بیٹھنے کے مواقع سے ہمدردی اور محبّت کے جذبات پروان چڑھتے ہیں۔ جس کی وجہ سے لوگ ایک دوسرے سے باخبر رہنے اور ان کے دکھ سکھ میں شریک ہو سکتے ہیں۔ پڑوس کو ایک معاشرتی ادارہ ہونے کی حیثیت سے یہ مقام حاصل ہے کہ اس کے افراد اپنے کھانے میں کبھی کبھی ایک دوسرے کو شریک کریں، کوئی بیمار ہو اس کی عیادت کریں، کوئی انتقال کر گیا ہو اس کی تعزیت کریں، خوشی ہو تو مبارک باد دیں، غرض وہ تمام حُقوق ادا کریں جو باہمی تعاون کے لیے ضروری ہیں۔ اسی طرح معاشرہ سنورتا ہے اور پھلتا پھولتا ہے۔

مدرسہ

مدرسہ ایک اہم مُعاشرتی ادارہ ہے جو علم سکھانے اور اسے فروغ دینے کا کام انجام دیتا ہے۔ قوموں کی تاریخ میں مدرسے کو ایک اہم مقام حاصل رہا ہے۔ ابتدا میں یہ ادارہ کسی رسمی صورت میں اپنے فرائض انجام نہیں دیتا تھا۔ بلکہ اس مقصد کے لیے چرچ، مساجد اور مندر وغیرہ استعمال ہوتے تھے۔ بعد میں اس کو رسمی طریقے سے منظم کیا گیا۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں بچوں کی ذہنی و جسمانی تعلیم و

تربیت ہوتی ہے۔ بچوّں کا ذہن ناپختہ ہونے کی وجہ سے ہر بات کو نقش کرلیتا ہے۔
اس لیے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ قوم کو بنانے اور بگاڑنے میں بچوں کی ابتدائی تعلیم و تربیت کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ اس نظریہ کو سامنے رکھتے ہوئے یہ لازمی ہے کہ ابتدائی نصاب کو اخلاقی اَقدار کے ساتھ ساتھ قومی نظریہ کے مطابق مرتّب کیا جائے تاکہ بچہ تعلیم مکمل کر کے نکلے تو ایک محبِّ وطن شہری اور باصلاحیت نوجوان ہو۔
مدرسہ جو ابتدائی تعلیم کا گہوارہ ہوتا ہے بچوں میں علم کی وہ شمع روشن کرسکتا ہے جو ان میں سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیتوں میں نکھار پیدا کردے۔ مشہور ماہرِ تعلیم پروفیسر راس کے نزدیک تعلیم ایک ایسا عمل ہے جو ذہنی اور اخلاقی، جسمانی یا سماجی حیثیت سے بچّے کی فطری صلاحیتوں، خوبیوں اور اس کے باطن میں چھپی ہوئی صلاحیتوں کو عملی زندگی میں بروئے کار لاتا ہے۔
مدرسہ جو طالب علم کے کردار میں اتنی وسعت پیدا کردیتا ہے کہ وہ اپنے ماحول سے ہم آہنگی حاصل کرسکے اور اپنی صلاحیتوں کو کام میں لائے۔ تعلیم گاہ کے پہلے مرحلے میں بچّہ ابتدائی ماحول، اساتذہ اور متعلّقین کا پورا پورا اثر قبول کرتا ہے اس کے بعد کے مرحلے میں جب کہ وہ جوانی کی طرف قدم بڑھا رہا ہوتا ہے اس کا واسطہ قدرے وسیع برادری سے پڑتا ہے۔ اس مرحلے میں بچے کے ذہن پر کچھ ابتدائی اثرات موجود ہوتے ہیں اور وہ اخلاق و آداب کے پہلے مرحلے سے نکل چکا ہوتا ہے۔ اس مرحلے میں وہ ایک ایسی گروہی تنظیم سے وابستہ ہوتا ہے جس میں رنگ و نسل، امیر و غریب اعلیٰ و ادنیٰ اور کالے اور گورے کی تفریق نہیں ہوتی۔ سب میں باہمی محبّت، خلوص اور اخوت کے جذبات ہوتے ہیں اور سب ایک مُساوی سطح پر ملتے ہیں۔ اس کے بعد تعلیم کے اعلیٰ مَدارِج کی باری آتی ہے۔ جن کی اپنی اہمیت ہے۔ لیکن ان کے لیے یہ جو طالب علموں کے ذہنوں کو علم کے وسیع میدانوں سے روشناس کراتے ہیں۔
تعلیمی اداروں کے فرائض میں سب سے پہلی ذمّہ داری یہ ہے کہ وہ طلبہ کی معلومات میں ان کی عمر اور استعداد کے مطابق اضافہ کریں۔ دوسری ذمے داری ان کی کردار سازی ہے جو تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت کے زمرے میں آجاتی ہے اور یہ بہت ضروری ہے۔ تیسری ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اپنی ثقافت کو جو کتابوں

کے ذریعے ہم تک پہنچی ہے نسل در نسل منتقل کرتے جائیں تاکہ طلبہ اس سے واقف ہوں۔ چوتھی ذمہ داری طلبہ میں ہر درجے کے مطابق فنی اور تیکنیکی مہارت کو بڑھانے کی کوشش ہے۔ یہی تعلیم و تربیت آگے چل کر بچے کو عملی زندگی میں پیشہ ورانہ ذمے داریوں کو اٹھانے کا اہل بناتی ہے اور اس طرح وہ معاشرے میں بہتر اور فعّال کردار ادا کرسکتا ہے۔

مشق

١۔ مُعاشرہ کس طرح وجود میں آتا ہے؟
٢۔ کون کون سے بڑے معاشرتی ادارے ہیں؟
٣۔ کردار سازی سے کیا مراد ہے؟
٤۔ خاندان کی ضرورت کیوں پیش آتی ہے؟
٥۔ خاندان میں والدین کا کیا کردار ہے؟
٦۔ کن وجوہات کی بنا پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ پڑوس ایک اہم مُعاشرتی ادارہ ہے؟
٧۔ پڑوسی کے کیا کیا حُقوق ہوتے ہیں؟
٨۔ قوموں کی تاریخ میں مدرسے کی کیا اہمیت ہے؟
٩۔ مدرسہ طالب علم کے کردار میں وُسعت کس طرح پیدا کرتا ہے؟
١٠۔ تعلیمی اداروں کے کیا کیا فرائض ہیں؟

قانون کا احترام

قانون سے مراد ایسے اصول اور قواعد ہوتے ہیں جو ریاست میں رہنے والے افراد کی طرزِ زندگی کو متعین کرتے ہیں تاکہ افراد کی اجتماعی زندگی خوش حال اور پُرسکون ہو سکے۔ کوئی بھی معاشرہ قوانین کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا۔ اپنی وُسعت کے اعتبار سے قانون ہمہ گیر ہوتے ہیں۔ ریاست کی طرف سے تمام شہریوں پر بلا امتیاز رنگ ونسل اور مذہب لاگو ہوتا ہے۔

ایک اچھے شہری کا فرض ہے کہ وہ قانون کا احترام کرے کیونکہ قوانین اسی کے فائدے اور تحفظ کے لیے بنائے جاتے ہیں۔ انھیں توڑنے سے نہ صرف خود کا نقصان ہوتا ہے بلکہ پورا مُعاشرہ افراتفری اور بدنظمی کا شکار ہو جاتا ہے۔

قدیم زمانے میں جب لوگ انتہائی سادہ زندگی گذارتے تھے۔ ان کے جھگڑوں کے فیصلے، لوگوں کی رائے، رسم و رواج اور مذہبی تعلیمات کی روشنی میں کیے جاتے تھے۔ یہ طریقہ طویل عرصے تک قائم رہا۔ یہاں تک کہ رسم ورواج نے قانونی درجہ حاصل کرلیا۔ اور آج بھی مُعاشرتی فیصلوں میں ان کو بہت دخل ہے۔ کسی بھی مُعاشرے میں قانون کے بغیر عدل وانصاف قائم نہیں ہو سکتا۔

قانون اور اخلاق کا ایک دوسرے سے گہرا تعلق ہے۔ یعنی ہر دور کا مقصد اچھا شہری بنانا ہے۔ اگرچہ علمِ اخلاق کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اس میں ہر وہ عمل شامل ہے جو صحیح اور فائدہ مند ہو۔ لیکن قانون ان اعمال کے بارے میں حکم دیتا ہے جن کی تعمیل نہ ہونے پر وہ سزا دے۔ قانون کے دائرے میں اعمال کے ظاہری نتائج قابلِ غور ہوتے ہیں۔ جبکہ اخلاق انسان کی پوری زندگی پر مُحیط ہے۔ انسان کے باطنی خیالات اور خواہشات بھی اس کے دائرے میں شامل ہیں اور ظاہر افعال بھی۔ مثلاً قانون کے دائرے میں یہ ہے کہ انسان کو قتل اور چوری سے باز رکھا جائے ورنہ اس کے مجُرم کو سزا دی جائے۔ مگر دائرۂ اخلاق میں نہ صرف قتل اور چوری سے باز

رہنے کا حکم دیا جاتا ہے بلکہ اس کی طرف توجہ بھی قابلِ مذمت سمجھی جاتی ہے۔

معاشرے میں ایک منظم اور متمدن زندگی گزارنے کے لیے قانون ضروری ہے۔ اس کے بغیر عدل و انصاف قائم نہیں ہو سکتا۔ اگر قانون شکنی ہو گی اور قانون کا احترام نہ ہو گا تو لوگ اپنی جان و مال اور عزت کی حفاظت کے سلسلے میں خوفزدہ اور غیر مطمئن رہیں گے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہر شخص قانون کا احترام کرے تاکہ ہر ایک کو تحفظ اور انصاف مہیا ہو سکے۔

قانون سازی کے وقت اخلاقی قدروں کو پسِ پشت نہیں ڈالا جا سکتا ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ اخلاقی قدریں پھیل کر وسیع اور مضبوط ہو جائیں تو قانونی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔

ریاست کی اہم ذمہ داری ہے کہ ملک میں امن و امان قائم کرے اور لوگوں کی جان و مال اور عزت کا تحفظ فراہم کرے۔ معاشرہ میں اجتماعی عدل خصوصی اہمیت رکھتا ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ تمام شہریوں کو قانون کی نگاہ میں مساوی مقام حاصل ہو۔ مرتبہ اور منصب کی وجہ سے کسی کو قانون شکنی کرنے یا کسی کی حق تلفی کرنے کی قطعی اجازت نہ ہو۔ اگر ایسا ہو تو قانون بلا امتیاز ہر کس و ناکس کو انصاف مہیا کرے۔ قانون تمام افراد کے لیے یکساں ہوتا ہے۔ اس کی خلاف ورزی قابلِ سزا جرم ہے۔

قانون کا احترام کرنے کا سچا جذبہ اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب ریاست کے تمام طبقات کے ساتھ یکساں سلوک کیا جائے۔ کوئی فرد قانون سے بالاتر نہ ہو۔ قانون کی نگاہ میں ریاست کے تمام شہری خواہ وہ امیر ہوں یا غریب، افسر ہوں یا ماتحت برابر ہوں اور قانون نافذ کرنے والے اور عدل انصاف کرنے والے کسی بھی اثر و رسوخ کو خاطر میں نہ لائیں۔

جب تک کسی ملک میں قانون کا احترام قائم نہیں ہوتا اس وقت تک وہاں کے لوگ نہ تو اپنے حقوق سے صحیح طور پہ بہرہ ور ہو سکتے ہیں اور نہ ہی معاشرتی زندگی اچھی طرح گذار سکتے ہیں۔

مشق

۱۔ قانون سے کیا مراد ہے؟
۲۔ قانون کے سلسلے میں ایک اچھے شہری کے کیا فرائض ہیں؟
۳۔ اخلاقی اقدار کا قانون سے کیا تعلق ہے؟
۴۔ ریاست میں امن وامان قائم رکھنے کے لیے قانون کیا کردار ادا کرتا ہے؟
۵۔ قانون کا احترام کرنے کا سچا جذبہ کب پیدا ہوتا ہے؟

تیار کردہ

سندھ ٹیکسٹ بک بورڈ، جام شورو، منظور شدہ وفاقی وزارتِ تعلیم حکومت پاکستان، اسلام آباد بطور واحد درسی کتاب برائے تمام مدارسِ پاکستان بموجب سرکلر نمبر ایس ۱۲۔ ۳/۸۴۔ اے۔ ای۔ اے (آئی۔ ای) مورخہ ۲۹ر ستمبر ۱۹۸۷ء

قومی ترانہ

پاک سر زمین شاد باد — کشورِ حسین شاد باد
تو نشانِ عزمِ عالی شان — ارضِ پاکستان
مرکزِ یقین شاد باد

پاک سر زمین کا نظام — قوّتِ اُخوتِ عوام
قوم، مُلک، سلطنت — پائندہ تابندہ باد
شاد باد منزلِ مراد

پرچمِ ستارہ و ہلال — رہبرِ ترقی و کمال
ترجمانِ ماضی، شانِ حال — جانِ استقبال
سایۂ خدائے ذوالجلال

پبلشرز کوڈ نمبر ایس ٹی بی 17 — سلسلہ نمبر

ماہ و سالِ اشاعت	ایڈیشن	تعداد	قیمت
April, 2003	1st.	2,000	Rs. 13.00